دیوانے پروانے

پروانے میں اس وقت تک جل مرنے کی لگن پیدا
نہیں ہوتی،
جب تک اس میں دیوانے جیسی دیوانگی پیدا نہ ہو۔
اور دیوانے کی دیوانگی اس وقت تک تشنہ ہے۔
جب تک اس میں پروانے کی طرح جل مرنے کی
بے باکی نہ ہو۔
وہ دیوانہ تھا، تیر کی طرح صرف محبت کے دل میں
ترازو ہوتا تھا۔
وہ پروانہ تھا۔ شمع کے باہر آگ ہوتی ہے۔ پروانے
کے اندر آگ تھی۔
اور پروانے کو اپنی آگ نہیں جلاتی
اسے شمع جلاتی ہے اور موم کے آنسو روتی ہے۔

دیوانے پروانے

[illegible]روڈی بابا کی کٹیا کے آگے ان کے عقیدت مندوں کا میلہ سا لگا تھا۔ عورتیں شب [illegible]ی پوریاں پراٹھے اور حلوے لے کر آئی تھیں۔ بچے پٹاخوں سے دل بہلا رہے [illegible] بوڑھے کٹیا کے آس پاس موم بتیاں روشن کر رہے تھے اور نوجوان آنکھیں سینک [illegible] تھے۔

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ شادی بیاہ کی تقریب ہو یا عرس مبارک کا میلہ یا [illegible] کا دیدار، جہاں عورتیں ہوتی ہیں وہاں صرف کسی بزرگ سے عقیدت نہیں [illegible] چور محبتیں اور چور نگاہیں بھی ہوتی ہیں جو اس بھیڑ میں ایک دوسرے کو [illegible] ٹٹولتی رہتی ہیں۔

[illegible] رنگ برنگ آنچل لہرا رہے تھے۔ چہروں کی چاندنی میں جلتی ہوئی موم بتیاں ماند [illegible] تھیں۔ گوٹے کناری اور سلمی ستاروں سے مزین ملبوسات میں بجلیاں بھری تھیں [illegible] سے ادھر کوند رہی تھیں۔ پٹاخے چھوٹ رہے تھے ہفت رنگ مہتابیاں سرسراتی [illegible] ن کی طرف جا کر چیخ رہی تھیں اور رنگوں کے فوارے چھوڑ رہی تھیں۔ ان [illegible] دھوپ چھاؤں میں حسیناؤں کے چہروں پر کبھی نارنجی رنگ لہراتا، کبھی دھانی، کبھی [illegible]۔ کبھی وہ چہرے شہابی شہابی ہو جاتے اور ترستی نگاہوں کے لیے جوالی جوالی بن

جاتے۔ رنگ و نور کے سیلاب میں نگاہیں کہیں ٹھہرتی نہیں تھیں اور روگی بابا کو دعائیں دیتی تھیں۔

پھر تمام چہرے ماند پڑنے لگے۔

شاداں آ رہی تھی۔

ستاروں کے جھرمٹ میں چاند طلوع ہو رہا تھا۔ پھولوں کی انجمن میں گلاب کھل رہا تھا۔ تمام نگاہیں خود بخود اس پر مرکوز ہو گئی تھیں۔ وہاں جتنے رنگ تھے وہ سب کے سب اس کے حسین وجود میں سمٹ آئے تھے۔ وہ خراماں خراماں آ رہی تھی۔ اس کی چال میں ایسی نزاکت اور لطافت تھی جیسے ریشم لہرا رہا ہو۔ اس ریشمی بدن کا نام خوب سوچ سمجھ کر شاداں رکھا گیا ہو گا۔

اس کے آگے پیچھے کنیزیں تھیں جو اپنے ہاتھوں میں حلوے پوریوں اور موم بتیوں کے تھال اٹھائے ہوئے تھیں۔ مرد' عورتیں' بچے اور بوڑھے سب کے سب دو حصوں میں تقسیم ہو کر اسے درمیان سے گزرنے کا راستہ دے رہے تھے۔ وہ جاگیردار چوہدری برکت علی بنگش کی بیٹی اور سات کڑیل بھائیوں کی ایک بہن تھی۔ سات گاؤں ادھر اور سات گاؤں ادھر تک ان کی زمینیں پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ جہاں سے گزرتی' اس کی راہ میں آنکھیں بچھا دی جاتیں۔ کتنے ہی دل والے ایسے تھے جو اس کے قدموں تلے اپنا دل بچھانا چاہتے تھے لیکن دولت کی افراط' جاگیرداری کا رعب اور خونخوار جلاد قسم کے سات بھائیوں کی ہیبت ایسی طاری تھی کہ شاداں کے جلو میں ہمیشہ موت نظر آتی تھی۔

چھپر پھاڑ کر دینے والے نے اسے بے حساب دولت کے ساتھ بے پناہ حسن بھی دیا تھا تاکہ نوجوان دور سے دیکھیں' تڑپیں' للچائیں اور آہیں بھرتے رہ جائیں۔ ایک بار کسی نوجوان کی آہیں سات بھائیوں تک پہنچ گئی تھیں۔ کہتے ہیں کہ ساتوں بھائی اسے پکڑ کر کہیں لے گئے تھے اور سات دنوں تک باری باری ہر بھائی اسے اذیتیں دیتا رہا۔ آٹھویں دن کپاس کے کھیت میں اس کی لاش ملی۔ اس کے جسم پر کوڑوں کے نشانات' جلتی ہوئی سلاخوں کے داغ' ٹوٹے ہوئے دانت اور اکھڑے ہوئے ناخن بتا رہے تھے کہ وہ اذیتوں اور عذابوں سے گزر کر موت کی آغوش تک پہنچا ہے۔

بستی والے لاش کو اٹھا کر تھانے لے گئے۔ پھر تھانے والوں کے حکم سے مجبور ہو کر

اسے چپ چاپ قبرستان میں دفن کر آئے۔ ان دنوں انگریزوں کی حکومت تھی اور بنگش بھائی حکومت برطانیہ کے وفادار تھے۔ لہٰذا خون معاف تھے۔ اس واقع کے بعد پھر کسی نے شاداں کے لیے آہیں بھرنے کی جرات نہیں کی۔

دل کے تہ خانے میں آہوں کو قید کیا جا سکتا ہے مگر نگاہوں کو بے لگام ہونے سے روکا نہیں جا سکتا۔ وہ ان کے درمیان سے گردن اکڑائے سینہ تانے ایک شان بے نیازی سے گزر رہی تھی اور دل والے سہمی سہمی اور جھکی جھکی نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے اور خاموشی سے سوچ رہے تھے کہ کوئی تو ہوگا جو اس حسن و شباب کی تجوری کو کھولے گا اور اس کے بھائیوں کی تنی ہوئی گردنوں کو جھکا دے گا۔ ہاں کوئی تو ہوگا......

وہ کٹیا کے دروازے کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔ کنیزیں پرے ہٹ کر دروازے سے ذرا دور ہو کر کھڑی ہوگئیں۔ وہ دروازہ ہمیشہ بند رہتا تھا۔ صرف شاداں کی آمد پر کھلتا تھا۔ برسوں سے یہی دستور تھا۔ وہ روزانہ شام کو روٹیاں لے کر آتی تھی۔ روگی بابا کے نماز پڑھنے اور روٹیاں کھانے تک ان کے پاس ادب سے سر جھکائے بیٹھی رہتی تھی پھر خالی برتن لے کر واپس چلی جاتی تھی۔

کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ دنیا سے رغبت نہ رکھنے والے روگی بابا نے بھی ایک حسین امیرزادی کو لفٹ دی ہے۔ حالانکہ دست شفقت رکھنے کے لیے بستی میں اور بھی غریب لڑکیاں تھیں۔ ویسے حقیقت یہ ہے کہ روگی بابا اس سلسلے میں غیر جانب دار تھے۔ ان کی نگاہوں میں کسی کی دولت اور شان و شوکت کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ جاگیردار کی لڑکی شاداں بھی ان کے لیے ایک عام سی لڑکی تھی۔ شاداں اور روگی بابا کی قربت کا قصہ یوں ہے کہ شاداں کو بچپن میں سوکھے کی بیماری لگ گئی تھی۔ یہ مرض ایسا ہوتا ہے کہ جان لے کر ہی چھوڑتا ہے۔ وہ سات بیٹوں کے بعد ایک بیٹی تھی جو بڑی منتوں اور مرادوں کے بعد پیدا ہوئی تھی۔ چوہدری برکت علی نے اس کا علاج کرنے کے لیے اپنی تجوری کا منہ کھول دیا۔ حکیم، ڈاکٹروں کی دوائیں کھلائیں۔ ٹونے ٹوٹکوں سے کام نکالنا چاہا لیکن وہ دن بہ دن سوکھ کر ہڈیوں کا ڈھانچا بنتی چلی گئی۔ جب دنیا جہان کی دوائیں کام نہ آئیں تو وہ ماں کے لیے اس ننھی سی بچی کو لے کر کٹیا کے دروازے پر گئے۔

روگی بابا کی گوشہ نشینی کا یہ عالم تھا کہ اس علاقے کا جاگیردار چوہدری برکت علی بھی

کٹیا کے اندر جا کر ان کی عبادت میں مخل ہونے کی جرات نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے بیمار بچی کو دہلیز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"بابا! شاید میرے نصیب میں بیٹی نہیں ہے۔ میں مایوس ہو گیا ہوں لیکن آپ خدا کی ذات سے مایوس نہیں ہوتے۔ میں اسے آپ کے دروازے پر چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ آپ کی دعاؤں کے طفیل یہ بچ گئی تو تمام عمر آپ کی خدمت کرتی رہے گی۔ یہ پہلے آپ کی خادمہ ہوگی پھر میری بیٹی کہلائے گی۔"

وہ دن تھا اور آج کا دن ہے۔ شاداں اس دروازے کی ہو کر رہ گئی۔ روگی بابا کسی کی خدمت گزاری پسند نہیں کرتے تھے۔ دنیاوی رشتے توڑنے کے باوجود انہوں نے شاداں کو گود میں کھلایا تھا۔ راتیں جاگ جاگ کر اس کی تیمارداری کی تھی اس لیے اس لڑکی سے انہیں گہری انسیت اور لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ انہوں نے ہر شام اسے کٹیا میں تھوڑی دیر کے لیے آنے کی اجازت دے دی تھی۔ شب معراج اور شب قدر کی شام کو بھی عام عقیدت مندوں کے لیے اس وقت تک دروازہ نہ کھلتا جب تک شاداں نہ آجاتی۔ وہ خوش نصیب تھی کہ اسے دولت بھی ملی تھی عزت اور حسن بھی ملا تھا اور ایک درویش کی ترجیحی شفقت بھی۔ شاید ان ہی باتوں نے اسے حد سے زیادہ مغرور بنا دیا تھا۔

اس نے دروازے پر دستک دیتے ہوئے کہا۔

"بابا دروازہ کھولیے۔ میں ہوں شاداں۔"

یہ کہہ کر اس نے چاروں طرف مجمع کو یوں دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ عالی شان محل ہو یا فقیر کی جھونپڑی' ہر جگہ مجھے اولیت حاصل ہے۔

ایک حسین دوشیزہ بے اعتنائی اور بے نیازی کا مظاہرہ کرے تو وہ ستم شعار کچھ اور زیادہ حسین نظر آتی ہے بلکہ ایک چیلنج بن جاتی ہے کہ کوئی اس کی پرچھائیں تک نہیں پہنچ سکتا۔ وہاں اس مجمع میں کوئی تو ایسا دل جلا ہوگا جو اس چیلنج کو قبول کر رہا ہوگا اور اسے حاصل کرنے کے لیے دل ہی دل میں قسمیں کھا رہا ہوگا۔

دروازہ کھل گیا۔ کٹیا کے اندر وہ نیم تاریکی میں کھڑے ہوئے تھے۔ دراز قد' جھکی ہوئی کمر' کھانستا ہوا بڑھاپا اور کراہتی ہوئی آواز۔

"آؤ بیٹی! آجاؤ......"

وہ پلٹ کر زمین پر بچھی ہوئی چٹائی پر آئے اور کٹیا کی پچھلی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ شاداں چٹائی پر دوزانو ہو کر موم بتی جلانے لگی۔ بابا نے کہا۔

"بیٹی! ایک سے زیادہ نہ جلانا۔"

"کیوں؟ میں تو پوری سو موم بتیاں لائی ہوں۔"

"دوسرے بھی تو لائے ہیں بیٹی! وہ بھی اس کٹیا کو روشن کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے تمہیں بارہا سمجھایا ہے کہ اپنی خوشی کے آگے دوسروں کی خوشیوں کو فراموش نہ کرو۔ یہ لوگ جو میرے دروازے پر آئے ہیں۔ وہ ایک ایک موم بتی کی تھوڑی سی روشنی مجھے دے کر خوش ہونا چاہتے ہیں۔ تم ان سے ان کا حق نہ چھینو۔"

وہ ناراضگی سے منہ پھلا کر بولی۔

"وہ بھی ایک جلائیں گے اور میں بھی ایک جلاؤں گی تو ہمارے درمیان فرق کیا رہ جائے گا۔ آپ یہ نہیں سوچتے کہ میں مرحوم برکت علی کی بیٹی ہوں۔ اگر کوئی ایک موم بتی جلاتا ہے تو مجھے سو سے زیادہ جلانا چاہیں۔"

"اگر کوئی ایک روٹی کھاتا ہے تو تمہیں سو روٹیاں کھانی چاہئیں۔ کیا تم امیری غریبی کی تفریق کے لیے سو روٹیاں ہضم کر سکتی ہو؟ میں تمہیں دنیاوی خواہشات سے چھڑا کر دین دار نہیں بنا سکتا مگر اتنی نصیحت ضرور کرتا ہوں کہ خود کو برتر نہ سمجھو۔ افضل اور برتر ذات صرف خدا کی ہے۔ تم عورت ذات ہو اور عورت ایک شمع کی مانند ہوتی ہے جو اپنی طبعی عمر تک جل جل کر اپنے گھر کی جنت کو روشن رکھتی ہے۔ ایک کسان کی بیٹی ہو یا جاگیردار کی لختِ جگر' دونوں ہی کا کام جلنا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کچھ جلنے والیاں اپنے گھروں کو بھی جلا کر رکھ دیتی ہیں۔"

شاداں نے ابھی ابھی ایک شمع روشن کی تھی۔ اسی وقت ایک پروانہ کہیں سے آگیا تھا اور شمع کے اطراف چکر کاٹ رہا تھا۔ بابا کی نصیحتیں اب اس کے کانوں تک نہیں پہنچ رہی تھیں۔ وہ بڑی محویت سے اس پروانے کو دیکھ رہی تھی۔ بابا نے یہ تو کہا تھا کہ وہ شمع ہے مگر یہ نہیں کہا تھا کہ اس شمع کا طواف کرنے کے لیے کوئی پروانہ بھی آسکتا ہے۔

وہ مغرور تھی مگر کسی پروانے کے متعلق سوچتی ضرور تھی۔ یہ ناممکن ہے کہ عمر کے الاؤ پر کورے بدن کی ہانڈی چڑھی ہو اور جذبات کی کھچڑی نہ پکتی ہو۔ وہ پکتی ضرور تھی مگر

بھائیوں سے سہمی رہتی تھی۔ اس کے بھائی کسی اونچے خاندان کے کسی ایسے بے وقوف نوجوان کی تلاش میں تھے جو شاداں سے شادی کرکے ان کی حویلی میں رہے اور شاداں کے حصے کی زمینیں لے کر الگ ہونے کا خواب نہ دیکھے۔ وہ بھی یہی سوچتی تھی کہ کوئی پروانہ اونچے خاندان سے اڑتا ہوا آئے لیکن وہ احمق نہ ہو بلکہ اس کے بھائیوں کی طرح دلیر ہو۔ وہ بچپن ہی سے بھائیوں کو دیکھتی آئی تھی۔ ان کے غرور اور غلبے' حاکمانہ اور ظالمانہ رویے' ان کی دلیری اور درندگی کو یک جا کرکے اس نے اپنے خیالوں میں ایک گبرو جوان کی تصویر بنائی تھی۔ وہ اس کے خیالوں میں آتا تھا اور محبت کی خیرات مانگنے کے بجائے اس سے چھین کرلے جاتا تھا۔

"کیا سوچ رہی ہو؟"

"آں۔" وہ چونک گئی۔ "جی کچھ نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں۔"

"جاؤ دروازہ کھول دو۔ دوسروں کو بھی آنے دو۔"

وہ چپ چاپ اٹھ کر دروازے تک گئی اور اسے کھول دیا۔

"اندر آجاؤ۔" اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"مرد عورتیں' بچے اور بوڑھے ایک ایک دو دو کرکے دروازے سے داخل ہونے لگے اور باآواز بلند بابا کو سلام کرنے لگے پھر کچھ لوگ دوزانو ہو کر ادب سے بیٹھ گئے۔ کچھ موم بتیاں جلانے لگے۔ مرد عورتیں سب کے سب کھچڑی ہو کر کٹیا میں بھر گئے تھے۔ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ شاداں خود کو بلند اور نمایاں رکھنے کے لیے بابا کے پاس آکر بیٹھ گئی۔

کچھ لوگ بابا کو دیکھ رہے تھے اور کچھ شاداں کو تک رہے تھے۔ بابا کلام پاک اور احادیث کے حوالے دے کر نصیحتیں کر رہے تھے۔ شاداں ایک شان بے نیازی سے گردن اکڑائے سامنے دیوار کو تک رہی تھی۔ اپنے سے چھوٹے لوگوں پر نظر ڈالنا اس کی توہین تھی۔ وہ دیکھنے کے لیے نہیں خود کو دکھانے کے لیے پیدا ہوئی تھی۔

پھر ایسا ہوا کہ ایک گوشے میں بیٹھی ہوئی عورت کے سر سے چادر ڈھلک کر پیچھے جلتی ہوئی ایک موم بتی پر گر گئی۔ بتی کی لو نے چادر کو پکڑ لیا' چادر نے آگ قبول کرلی۔ ایک بچے نے چیخ کر کہا۔

"آگ۔ آگ لگ گئی....."

عورت نے گھبراہٹ میں اپنے بدن پر پڑی آدھی چادر بھی ایک طرف اچھال دی۔ چادر کے ساتھ آگ کے شعلے لپکتے ہوئے پیال کے بستر پر آئے اور چشم زدن میں گھاس کے بستر کو اپنی لپیٹ میں لیتے چلے گئے۔ لوگ ہڑبڑاتے شعلوں کو بجھانے کی کوشش کرنے لگے۔ عورتیں اور بچے چیخیں مارتے ہوئے دروازے کی جانب بھاگنے لگے۔

دروازہ چھوٹا تھا اس لیے مختلف سمت سے بھاگنے والے اس میں پھنس گئے تھے' الجھ رہے تھے' چیخ رہے تھے۔ اسی افراتفری میں کتنی ہی موم بتیاں ٹھوکروں میں آکر دیواروں کے پاس گر گئیں کچھ بجھ گئیں اور کچھ دیواروں کو چومنے لگیں۔ چھت گھاس پھوس کی بنی ہوئی تھی اور دیواریں بانس کی کھپچیوں سے کھڑی کی گئی تھیں۔ لہٰذا آگ پکڑتے دیر نہ لگی۔ ادھر بھی آگ ادھر بھی آگ۔ شعلے' تپش' دھواں اور کھانسیاں۔ راستہ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ آگے بڑھتی تھی پھر لوگوں سے ٹکرا کر پیچھے لڑکھڑا جاتی تھی۔ سب کو اپنی اپنی فکر تھی کوئی ایک دوسرے کو نہیں پہچان رہا تھا۔ عورت ہو یا مرد سب ہی دروازے کی طرف بڑھنے کے لیے اسے پیچھے کی طرف دھکیل رہے تھے۔ کچھ عقیدت مند روگی بابا کو پہلے ہی اٹھا کر دروازے کی جانب لے گئے تھے۔ وہ اکیلی بھٹک رہی تھی۔ جاگیردار کی بیٹی' سات جیالے بھائیوں کی بہن سیکڑوں مربع گز زمین کی مالکہ جس کی راہ میں لوگ آنکھیں بچھاتے تھے۔ اس بھیڑ میں اکیلی رہ گئی تھی اور ایک معمولی لڑکی کی طرح ٹھوکریں کھا رہی تھی۔ وہ فریاد کرنا یا گڑگڑانا نہیں جانتی تھی مگر اس وقت گڑگڑا رہی تھی۔ اپنی زندگی کی بھیک مانگ رہی تھی۔

"بچاؤ..... مجھے بچاؤ۔ مجھے راستہ دو..... ہائے ربا میں مرجاؤں گی....."

اس نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا۔ دھوئیں سے اس کا سر چکرا رہا تھا۔ وہ سب میں گرنے ہی والی تھی۔ اسی وقت کسی نے اسے تھام لیا۔ اپنے بازوؤں کے حلقے میں قید کرلیا۔ سہارا ملتے ہی اس نے سنبھلنے کی کوشش کی۔ دماغ گھوم رہا تھا۔ جلتے ہوئے نظارے گھوم رہے تھے۔ ان شعلہ جوالہ نظاروں کے پیش منظر میں ایک خوب صورت نوجوان نظر آیا۔ وہ کون تھا' وہ نہیں جانتی تھی۔ کسی کو جاننے پہچاننے کا ہوش نہیں تھا۔ بس ایک ہی التجا تھی کہ وہ جو کوئی بھی ہے' اسے شعلوں کی لپیٹ سے نکال کرلے جائے۔

"مجھے بچاؤ۔ خدا کے لیے یہاں سے مجھے نکال لو۔ میں تمہیں منہ مانگا انعام دوں گی۔ ہائے اللہ تم میرا منہ کیا تک رہے ہو؟ مجھے یہاں سے نکالو......

اس نے دونوں بازوؤں میں اسے اٹھالیا جیسے وہ کوئی ننھی سی بچی ہو یا پھولوں کی لچکتی ہوئی ٹہنی ہو یا منہ مانگا انعام ہو جسے اٹھانے میں زحمت نہیں ہوتی' راحت ملتی ہے۔

پھر وہ پچھلی دیوار کی جانب بڑھا۔ حالانکہ دروازے کی طرف اب بھیڑ نہیں تھی۔ کچھ لوگ رہ گئے تھے جو تیزی سے نکلتے جا رہے تھے۔ وہ بھی دروازے کے راستے آسانی سے نکل سکتا تھا لیکن وہ پچھلی دیوار کی جانب بڑھا جہاں شعلے بھڑک رہے تھے۔ دیوار آدھی سے زیادہ جل چکی تھی۔ اسے شعلوں کی جانب بڑھتے دیکھ کر شاداں نے ایک چیخ ماری اور اس کی گردن میں بانہیں ڈال کر لپٹ گئی۔ وہ بھول گئی کہ وہ خود ایک شعلے کی طرح لپٹ کر اجنبی کو جلا رہی ہے۔ اجنبی نے دیوار پر ایک زوردار لات ماری۔ دیوار کا کچھ حصہ ٹوٹ کر دوسری طرف گر پڑا۔ پھر وہ دوڑتا ہوا۔ لپکتے دہکتے شعلوں کے درمیان سے گزرتا ہوا کٹیا کے پیچھے چلا آیا۔ پیچھے چند قدم کے فاصلے پر گندم کی فصل کھڑی تھی۔ وہ لہلاتی فصل کی ہریالی میں دور تک دوڑتا چلا گیا۔

ایسی بات نہیں تھی کہ کسی نے اسے دیکھا نہ ہو۔ سب ہی ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے لیکن بدحواسی میں پہچان نہیں رہے تھے۔ کتنے ہی مرد تھے جو عورتوں اور بچوں کو اٹھا کر شعلوں سے دور لیے جا رہے تھے۔ ان میں وہ اجنبی بھی تھا جو ایک لڑکی کو گلے کا ہار بنائے کھیتوں کی طرف چلا گیا تھا اور لوگوں نے دیکھتے ہوئے بھی کچھ نہیں دیکھا تھا۔

شاداں گردن میں بانہیں ڈالے اس کے شانے میں منہ چھپائے' خوف سے آنکھیں بند کیے ہوئے تھی۔ وہ کچھ اس طرح خوفزدہ تھی کہ اب تک شعلوں کو اپنے آس پاس محسوس کر رہی تھی۔ بستی والوں کی آوازیں گڈمڈ ہو کر اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ وہ آوازیں سمجھا رہی تھیں کہ وہ ابھی تک رقص کرتے ہوئے شعلوں کے درمیان ہے۔

پھر وہ آوازیں دور ہونے لگیں۔ دور ہوتے ہوئے معدوم ہونے لگیں۔ خطرہ دور ہوا تو وہ اپنی موجودہ حالت کو سمجھنے کے قابل ہوئی۔ تب اسے پتہ چلا کہ اب شعلوں کی تپش ختم ہو چکی ہے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی ہیں۔ کوئی اسے اٹھائے بھاگتا چلا

جارہا ہے۔ ہر قدم پر اس کا بدن پھولوں بھری شاخ کی طرح جھٹکے کھا رہا ہے' لچک رہا ہے' مسک رہا ہے اور سانس لیتا ہوا سینہ کسی اجنبی کے چٹانی سینے سے ٹکرا ٹکرا کر دل کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ ہو رہا ہے۔

اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں اور شانے پر سے سر اٹھایا تو اسے چاروں طرف کھیت ہی کھیت نظر آئے۔ وہ کٹیا نظر نہیں آ رہی تھی۔ دور کہیں درختوں کے پیچھے چھپ گئی تھی۔ شعلوں کی سرخی بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ شاید آگ پر قابو پالیا گیا تھا یا کٹیا جل کر راکھ ہو گئی تھی۔ اس نے اجنبی کو دیکھا۔ اس کا چہرہ اس کے بالکل قریب تھا۔ چاندنی میں صاف نظر آ رہا تھا۔ سرخ و سفید رنگت' کشادہ پیشانی' شکار کو جھپٹ کر لے جانے والے چیتے کی طرح چمکیلی آنکھیں' ہانپتی اور غراتی ہوئی سانسیں' ہونٹ ایسے سفاک جو پیار کے لئے پکارتے ہیں اور پتھر کی طرح پیس کر رکھ دیتے ہیں۔ شاداں کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا اور وہ سہمے ہوئے لہجے میں بولی۔

"میں کہاں ہوں؟ تم کون ہو؟ مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟ یہ حویلی کا راستہ تو نہیں ہے۔ چھوڑ دو۔ مجھے چھوڑ دو۔"

وہ بازوؤں کی گرفت میں مچلنے لگی۔ اجنبی دوڑتے دوڑتے لڑکھڑا کر گر پڑا۔ گرنے سے جو چوٹ لگی' شاداں کو اس کا احساس ذرا کم ہوا۔ کیوں کہ اجنبی کا لمس کچھ نئے احساسات سے آشنا کر رہا تھا۔ وہ چند لمحوں کے لیے مچلنا اور تڑپنا بھول گئی پھر وہ پتھر کی سل کو اپنے اوپر سے ہٹانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بولی۔

"ہٹ۔ چھوڑو مجھے۔ نہیں تو شور مچادوں گی......"

اس نے شاداں کی دھمکی پر...... مہر لگا دی۔ وہ چند ساعتوں کے لیے جکڑ گئی۔ گونگی بن گئی۔ وحشت سے دیدے پھیلا کر اپنے چہرے پر چھائے ہوئے چہرے کو تکنے لگی۔ اس اچانک حملے سے وہ بوکھلا گئی تھی۔ پھر وہ اپنا سر دائیں بائیں جھٹکنے لگی۔ اجنبی نے الگ ہو کر کہا۔

"منہ مانگا انعام۔ تم نے کہا تھا۔ منہ مانگا انعام دوں گی۔ دو......"

وہ دوبارہ اس پر جھکا۔ شاداں جلدی سے کروٹ بدل کر لڑھکتی ہوئی ایک ہاتھ کے فاصلے پر ہٹ گئی اور اٹھ کر اپنا دوپٹہ اٹھانے لگی۔ اجنبی نے دوپٹے کو دوسری طرف سے

تھام لیا۔

پھر دونوں میں رسہ کشی ہونے لگی وہ دوپٹے کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی اور وہ اپنی طرف بلا رہا تھا۔ وہ چاہتا تو اسے ایک ہی چھلانگ میں دبوچ لیتا لیکن محبت کے کھیل میں شکار کے اصول بدل جاتے ہیں۔ وہاں پنجے نہیں مارے جاتے بلکہ پچکار کر بلایا جاتا ہے۔ ذرا ڈھیل دی جاتی ہے تاکہ بدکنے والی ہرنی مانوس ہو جائے۔

وہ پرے کھسکتے ہوئے بولی۔

"تم کون ہو؟"

"پروانہ۔" وہ ذرا آگے سرک گیا۔ "جب سے تمہیں دیکھا ہے۔ آنکھوں سے نیند اڑ گئی ہے۔"

"میرے بھائیوں کو جانتے ہو۔ وہ جلاد ہیں۔ تمہاری گردن اڑا دیں گے۔ بھاگ جاؤ یہاں سے۔"

وہ گھٹنوں کے بل دور ہونے لگی۔

اجنبی بھی گھٹنوں کے بل بڑھتے ہوئے بولا۔

"پروانے ڈرنا نہیں جانتے، جلنا جانتے ہیں۔ میں اس علاقے میں پہلی بار آیا ہوں۔ تم اپنے بھائیوں سے مجھے نہ ڈراؤ ہو سکے تو اپنے جلاد بھائیوں کو میرا نام بتا دینا۔ تم پر جان دینے والا مردا علی بنگش ہے جس کے نام سے کشمیر کے مہاراج ادھیراج تھراتے ہیں اور ان کے انگریز حاکم نے میرے سر کی قیمت دس ہزار روپے رکھی ہے۔ تمہارے بھائی دس ہزار لے جائیں گے یا میں تمہیں لے جاؤں گا۔"

وہ گھبرا کر تھوک نگلتے ہوئے بولی۔

"تت...... تم مجھے زبردستی لے جاؤ گے؟"

وہ جواب دینے سے پہلے چند لمحوں تک اس کے گلابی مکھڑے کو دیکھتا رہا۔ وہ سہمی سہمی سی دوشیزہ اتنی حسین لگ رہی تھی کہ اسے کھینچ کر آغوش میں چھپا لینے کا جی چاہتا تھا۔ اس نے گہری سانس لے کر کہا۔

"میں تمہیں اٹھا کر لے جا سکتا ہوں مگر تمہیں لے جاؤں گا۔ میں نے آج تک کمزوروں پر ظلم نہیں کیا اور تم کمزور ہو۔ میری محبت ہو۔ میں تمہیں بڑی نرمی سے اور

بڑے پیار سے حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ آؤں میرے پاس آجاؤ۔"

وہ ذرا آگے بڑھا۔ وہ ذرا پیچھے چلی گئی۔

"م...... میرے پاس نہ آؤ۔ مجھے ہاتھ نہ لگاؤ۔"

"وہ تو لگا چکا ہوں۔ شاداں! میری محبت کا جواب محبت سے دو۔ پھر دیکھو کہ میں تمہارے اشارے پر کس طرح جان دیتا ہوں یا پھر مجھ سے نفرت کرو۔ مجھے برا بھلا کہو۔ مجھ سے دور بھاگو تاکہ مجھے غصہ آئے اور میں ایک ہی ہلے میں تمہیں اپنالوں۔ دو میں سے کوئی ایک بات ہوگی۔ بولو' مجھ سے محبت کرو گی یا نفرت؟؟"

وہ الجھن میں پڑ گئی۔ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن۔ وہ محبت اس لیے نہیں کر سکتی تھی کہ برسوں کا غرور اور برتری کا احساس اس پر حاوی تھا۔ وہ اتنی آسانی سے کسی اجنبی کو اپنی انگلی سے پہنچے تک پہنچنے کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔ اس نے سہمی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا اور سہمے ہوئے لہجے میں بولی۔

"م۔ میرے بھائی مجھے تلاش کر رہے ہوں گے۔ میں جاؤں گی۔"

وہ دوپٹہ چھڑا کر گھٹنوں کے بل اس سے دور ہونے لگی۔

"دوپٹہ لیتی جاؤ۔" اس نے غرا کر حکم دیا۔

وہ ٹھٹک کر کانپنے لگی۔ وہ اس کی طرف آ رہا تھا۔ دونوں ہاتھ اور دونوں گھٹنے زمین پر ٹیکے' مست ہاتھی کی طرح جھومتا ہوا' قریب سے قریب تر ہو رہا تھا۔ وہ اپنے آپ میں سمٹنے لگی۔ اس نے گندم کے کتنے ہی خوشوں کو اپنی باہوں میں سمیٹ کر آنے والے سے پردہ کر لیا۔ وہ ایک دم سے بدک کر بھاگنے لگی۔ ہریالی کا پردہ کام نہیں آیا تھا۔

پھر بھاگنے اور ہانپنے' دیکھنے اور چھپنے کی آنکھ مچولی شروع ہو گئی۔ وہ گندم کی کھڑی فصل میں گم ہو گئے تھے۔ چاند انہیں نہیں دیکھ رہا تھا۔ چاندنی میں صرف اتنا نظر آ رہا تھا کہ ہری بھری فصلوں میں کہیں کہیں ہلچل سی ہو رہی ہے۔ گندم کے جوان خوشے کبھی ادھر سے سرسرا رہے تھے۔ کبھی یہاں ٹکرا رہے تھے۔ جھپٹنے اور پلٹنے اور پلٹ کر جھپٹنے کا ردعمل پیش کر رہے تھے۔

ٹی

"میں جاؤں گی......" احساس برتری جا رہا تھا۔ شان و شوکت جا رہی تھی۔ کر

"میں شور مچاؤں گی......" ایک نازک سی دھمکی تھی تاکہ ہونٹوں کی مہ

جائے۔

رات چپ ہوگئی۔ رات ایک بچھونا ہے۔ چاند ایک مسافر ہے جو چاندنی کے پنکھ پھیلا کر اس بچھونے پر آرام کرتا ہے اور اپنے وجود کی روشنی اس کے وجود میں سموتا ہے۔ روشنی کے اس ریلے سے رات کبھی گھبرائی رہتی ہے اور کبھی اس روشنی کے طلسم سے سحر زدہ ہو کر آہیں بھرتی ہے۔ آہ تم اب تک کہاں تھے۔ میری روشنی کے سمندر۔ کہاں تھے تم؟"

رات سوالی تھی۔ چاند جوابی تھا اور وقت ان کے درمیان سے گزرتا جا رہا تھا۔

پھر بہت دیر ہوگئی۔ بہت سارا وقت گزر گیا۔ تب رات نے بڑی محبت سے آہیں بھرتے ہوئے کہا۔

"نہیں جاؤں گی۔ تمہیں چھوڑ کر کبھی نہیں جاؤں گی۔ نہیں جاؤں گی....."

کٹیا کے شعلے بجھنے سے پہلے ہی ساتوں بھائی وہاں پہنچ گئے۔ وہاں بستی کی سب ہی عورتیں تھیں۔ ایک شاداں نہیں تھی۔

"کہاں ہے شاداں...... شاداں...... شاداں...... شاداں......"

سات گرجتی گونجتی آوازوں سے لوگوں کے دل دہلنے لگے۔ سب ہی ادھر سے ادھر بھاگتے ہوئے شاداں کو تلاش کرنے لگے۔ ساتوں اس علاقے کے حاکم تھے۔ انہوں نے پردہ کرنے والی عورتوں کے سر سے چادریں کھینچ لیں۔ گھونگٹ کاڑھنے والیوں کے گھونگٹ نوچ لئے لیکن بہن کا چہرہ کہیں نظر نہ آیا۔ تب انہوں نے بستی والوں کو حکم دیا کہ سب اپنے اپنے گھروں میں چلے جائیں۔ ہر گھر کی تلاشی لی جائے گی۔ جس کے ہاں وہ پائی جائے گی۔ اس کے سارے کنبے کو زندہ جلا دیا جائے گا۔

تمام مرد، عورتیں، بچے اور بوڑھے اپنے اپنے گھروں کی طرف بھاگنے لگے۔ کتنے ہی ملازموں اور کھیت کے مزدوروں کو بستی کے چاروں طرف دور دور تک پھیل جانے کا حکم دیا پھر ساتوں بھائی گھوڑوں پر سوار اپنے ہاتھوں میں گنڈاسے اور رائفلیں لیے اس کی تلاش میں نکل گئے۔

رات کے سناٹے میں ان کے للکارنے اور گرجنے کی آوازیں گونج رہی تھیں اور گھوڑوں کی ٹاپیں زمین کے سینے پر دور تک بجتی جا رہی تھیں۔

تین بھائی بستی کے ایک ایک گھر کی تلاشی لے رہے تھے۔ چار بھائی بستی کے باہر جانے والے راستوں پر دوڑے جا رہے تھے۔ کھیتوں کی طرف مزدور گئے ہوئے تھے۔

آدھی رات کے بعد وہ مایوس ہو کر گھوڑے سے اتر گئے اور کھیتوں کی طرف جانے لگے۔ وہ جہاں سے گزرتے تھے۔ مزدوروں کو آوازیں دے کر پوچھتے تھے۔ ہر جگہ یہی جواب ملتا کہ شاداں وہاں نہیں ہے پھر وہ اس جگہ آئے جہاں شاداں کو ہونا چاہیے تھا۔

وہ نہیں تھی وہاں دو مزدور بے ہوش پڑے تھے تیسرا ملازم جو قوی ہیکل تھا اور جو مرنے مارنے میں ہمیشہ ان بھائیوں کا ساتھ دیتا تھا۔ وہ زخمی پڑا ہوا کراہ رہا تھا۔

دو بھائیوں نے آگے بڑھ کر اسے جھٹکے سے اٹھایا اور جھنجوڑتے ہوئے پوچھا۔

"کہاں ہے شاداں؟"

"وہ شاداں کو حویلی کی طرف لے گیا ہے......" وہ رک رک کراہتے ہوئے بول رہا تھا۔ "کون لے گیا ہے اسے؟" ایک نے چیخ کر کہا۔

"وہ اشتہاری ملزم مراد علی بنگش......" زخمی کا سر شانے پر ڈھلک گیا۔ وہ بھی بے ہوش ہو گیا تھا۔

ساتوں بھائی لمحے بھر کے لیے سکتے میں آ گئے۔ ایک دوسرے کو حیرانی اور تشویش سے دیکھنے لگے پھر بڑے بھائی نے بڑک مار کر کہا۔

"اوئے مراد علی کی موت اسے یہاں لے آئی ہے۔ آؤ میرے ساتھ......"

وہ حویلی کی طرف دوڑنے لگا۔ اس کے ساتھ تمام بھائی فصلوں کو روندتے ہوئے اور شیروں کی طرح دھاڑتے ہوئے جا رہے تھے۔ حویلی کے راستے میں دو چار جیالے ملازم زخمی پائے گئے اور یہ بات ثابت ہوئی کہ وہ شاداں کو لے کر حویلی کی طرف گیا ہے۔

حویلی کے احاطے میں پہنچتے ہی چوکیدار نے بتایا کہ بی بی جی واپس آ گئی ہیں۔"

"کس کے ساتھ آئی ہے؟" ایک بھائی نے پوچھا۔

"کسی کے ساتھ نہیں سرکار۔ اکیلی آئی ہیں؟"

وہ سب تیر کی طرح حویلی میں داخل ہوئے۔ شاداں اپنی خواب گاہ میں پلنگ پر سمٹی سکڑی ہوئی بیٹھی تھی اور اس کی آدھی درجن بھابیاں اس سے طرح طرح کے سوالات کر رہی تھیں۔ شاداں کے جوابات سے وہ مطمئن نہیں تھیں۔ وہ بڑی ٹٹولتی ہوئی نظروں

سے اس کی بکھری ہوئی زلفیں، شکن آلود لباس اور چہرے کی اڑی ہوئی رنگت دیکھ کر اپنے طور پر بہت کچھ سوچ رہی تھیں..... اتنے میں اس کے تمام بھائی وہاں آگئے۔ بڑے بھائی نے ڈانٹ کر پوچھا۔

"کہاں گئی تھی؟"

"مم..... میں اپنی مرضی سے نہیں گئی تھی۔ وہ مجھے اٹھا کر لے گیا تھا۔"

سات جیالے بھائیوں کے جیتے جی کوئی ایک بہن کو اٹھا کر لے جائے۔ یہ توہین وہ برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ وہ غصے سے کانپنے لگے۔ ایک نے پوچھا۔ "وہ کہاں گیا ہے؟"

وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپائے رو رہی تھی۔ اس نے نفی میں سرہلا کر کہا۔

"میں نہیں جانتی۔ وہ مجھے حویلی کے سامنے چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ اس نے راستے میں آنے والے کتنے ہی لوگوں کو مار گرایا ہے۔ وہ بہت خطرناک ہے۔"

ساتوں اس خطرناک کو خطرناک قسم کی گالیاں دینے لگے اور اسے مار ڈالنے کی قسمیں کھانے لگے۔ ایک بھائی نے کہا۔

"وہ ہم سے بچ کر نہیں جا سکتا۔ رجب علی نے اسے پہچان لیا ہے۔"

"پہچان لیا ہے؟" ایک بھائی نے پوچھا۔ "کون ہے وہ؟"

"مراد بخش۔" ایک نے زمین پر تھوک کر کہا۔

شاداں چونک کر اپنے بھائیوں کو دیکھنے لگی۔ وہ اب تک دانستہ مراد کا نام نہیں لے رہی تھی۔ کسی خطرناک اجنبی کا ذکر کر رہی تھی تاکہ اس کے بھائی کسی اجنبی کی تلاش میں بھٹکتے رہ جائیں اور اس کے مراد پر شبہ نہ کریں۔

اس کا مراد۔ ہاں اب وہی اس کے دل کی مرادیں پوری کرنے والا مراد تھا۔ وہ اگرچہ چلا گیا تھا مگر اس کے بدن کے جوڑ جوڑ میں دکھ رہا تھا۔ اس کی نس نس میں سلگ رہا تھا۔ اس کے رس بھرے لبوں پر خیالی سانسوں کے سنگم سے مچل رہا تھا۔ جہاں دیکھنے والی آنکھیں بھی نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ وہ صرف چشم احساس سے دیکھ رہی تھی کہ وہ مسافر بدن کے شہر میں کہاں کہاں نشان سفر چھوڑ گیا ہے۔ وہ اتنی دور تک اور اس کے جذبات کی اتنی گہرائی تک پہنچ گیا تھا کہ سات بھائی اسے اپنی دنیا سے نکال سکتے تھے مگر بہن کے دل سے نہیں نکال سکتے تھے۔

اس رات کوئی نہ سو سکا تمام بھاییوں کو اس خوشی سے نیند نہیں آئی کہ جس بہن کو پھول کی طرح رکھا گیا تھا۔ اسے ایک گبرو جوان مسل کر چلا گیا ہے۔ ساتوں بھائی یہ سوچ رہے تھے کہ مراد علی بنگش ابھی ان کے علاقے سے باہر نہیں گیا ہوگا۔ ابھی وہ ناکہ بندی کر سکتے ہیں۔ انہوں نے اپنے تمام ملازموں اور بستی کے جوانوں کو بلایا جو انگریز سرکار کی جانب سے شائع ہونے والے پوسٹروں میں اس اشتہاری مجرم کی تصویر دیکھ چکے تھے۔ انہیں بستی کے چاروں طرف دور دور تک ڈیوٹی پر لگا دیا گیا۔ چار بھائیوں نے آس پاس کی بستیوں میں جاکر جوانوں کی یہ ڈیوٹی لگائی اور یہ اعلان کر دیا کہ جو مراد علی بنگش کو زندہ یا مردہ لے کر آئے گا۔ اسے سرکار کی طرف سے اعلان کی ہوئی انعامی رقم دی جائے گی۔

تین بھائی بستی کا چکر کاٹتے جلی ہوئی کٹیا کے پاس سے گزرے تو روگی بابا ایک درخت کے نیچے پلتھی مارے ہوئے تھے۔ انہیں اس حال میں دیکھ کر بھائیوں کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ دشمن کی تلاش کرنے کی دھن میں بابا کو بھول گئے۔ ان کے باپ چوہدری برکت علی نے بابا کو سکون سے عبادت کرنے کے لیے وہ کٹیا بنا کر دی تھی جواب جل کر راکھ ہو گئی تھی۔ وہ تینوں بابا کے سامنے دوزانو ہو گئے۔ ایک نے کہا۔ "بابا۔ آج رات آپ ہماری حویلی میں عبادت کریں کل آپ کے لیے نئی کٹیا تیار ہو جائے گی۔"

بابا کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ عبادت میں مشغول تھے۔ انہوں نے آنکھیں کھول کر دیکھا اور مسکرا کر کہا۔

"نہیں بیٹے۔ فقیر کی جگہ محلوں میں نہیں کٹیا میں ہے یا درختوں کے سائے میں۔ میں یہاں مطمئن ہوں۔ تم یہ بتاؤ کہ میری شاداں مل گئی؟"

"آپ کی دعاؤں سے مل گئی ہے۔" ایک نے جواب دیا۔

دوسرے نے کچھ سوچ کر پوچھا۔

"بابا! آپ بھی شاید کشمیر کے رہنے والے ہیں؟"

"ہاں"

"وہاں بنگش کے علاقے میں رہ چکے ہیں؟"

"ہاں۔"

"آپ مراد علی بنگش کو جانتے ہیں؟"

روگی بابا کی آنکھیں پھیل گئیں۔ چاند کی روشنی ان کی آنکھوں تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ درخت کے سائے آنکھوں کو چھپا رہے تھے۔ اس لیے یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں یا خوف سے۔

وہ چند لمحوں تک خاموش رہے پھر انہوں نے لرزتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"کون مراد علی؟"

"مہاراجہ کے ایڈی کانگ دھرم ویر کا قاتل۔ اس قتل کے بعد وہ کتنے ہی ڈوگرا سپاہیوں کو قتل کرتا رہا ہے۔ جس نے بھی دس ہزار کا انعام حاصل کرنے کے لیے اس کا پیچھا کیا وہ زندہ لوٹ کر نہیں آیا۔"

روگی بابا نے افسوس کا اظہار کیا۔

"آہ بے چارا مراد.....!"

ایک بھائی نے تعجب سے کہا۔

"آپ اسے بے چارہ کہہ رہے ہیں؟"

"ہاں وہ مظلوم ہے۔ وہ قاتل نہیں تھا۔ اسے قاتل بنا دیا گیا ہے۔ یہ بہت غلط ہے ایک شخص نے اس کی جوان بہن کو ایڈی کانگ کے عیش کدے میں پہنچا دیا۔ کون ایسا بے غیرت ہے جو اس ذلت کو برداشت کر سکتا ہے؟ وہ برداشت نہ کر سکا۔ درندہ بن گیا۔"

"پھر بھی بے چارہ کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔ وہ اپنی بہن کا انتقام لینے کے لیے دوسروں کی بہنوں کو اٹھا لے جاتا ہے۔"

"نہیں بیٹے۔ میں نے تو یہی دیکھا ہے کہ وہ دوسروں کی ماں بہنوں کی عزت کرتا ہے۔"

"آپ کچھ نہیں جانتے بابا۔ اب آپ سے کیا چھپانا۔ یہ بات تو اب دور دور تک جائے گی کہ وہ شاداں کو اٹھا کر لے گیا تھا۔"

"کب؟" بابا نے حیرت سے پوچھا۔

"آج شام کو جب آپ کی کٹیا میں آگ لگی تھی۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ شاداں کو لے جانے کے لیے اسی نے کٹیا میں آگ لگائی تھی۔"

روگی بابا خاموشی سے ان بھائیوں کو باری باری دیکھتے رہے پھر انہوں نے کہا۔

مجھ سے بحث نہ کرو۔ خاموشی سے میری باتیں سنو اور یہاں سے چلے جاؤ۔ وہ اتنا ظالم اور سنگ دل نہیں ہے کہ بستی کی بہو بیٹیوں اور معصوم بچوں کو زندہ جلانے کے لیے کٹیا میں آگ لگا دے۔ تم لوگ یہ نہ سمجھو کہ میں ایک قاتل درندے کی حمایت کر رہا ہوں' نہیں۔ میں صرف ان خوبیوں کو بیان کر رہا ہوں جو اس میں موجود ہیں۔ وہ چوٹ کھایا ہوا بندہ ہے' کسی کی بہن کو بری نظر سے نہیں دیکھتا۔ وہ شاداں کو اٹھا کر کیوں لے گیا تھا میں نہیں جانتا' خدا جانتا ہے۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ شاداں کا دشمن نہیں ہے۔ اگر ہوتا تو وہ تمہیں واپس نہ ملتی۔"

ایک بھائی نے ناگواری سے کہا۔

"وہ تنہا کہیں بھی چھپ سکتا ہے۔ شاداں اس کے لیے مصیبت بن جاتی۔ اسی لیے وہ اسے چھوڑ گیا ہے لیکن وہ بچ کر نہیں جائے گا۔ ہمارے آدمی چاروں طرف اسے تلاش کر رہے ہیں۔ صبح تک وہ ہمارے قدموں میں ہو گا۔"

روگی بابا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ تینوں تھوڑی دیر انتظار کرتے رہے کہ شاید وہ کچھ کہیں گے' پھر ایک نے کہا۔

"کل شام تک آپ کے لیے ایک نئی کٹیا تیار ہو جائے گی۔ ہم چاہتے ہیں کہ یہ کٹیا حویلی کے سامنے بنائی جائے کیونکہ ہم نہیں چاہتے کہ اب شاداں تنہا اتنی دور آیا کرے۔ وہ بدمعاش جب تک گرفتار نہیں ہو گا۔ ہم محتاط رہیں گے۔"

"جہاں چاہو وہاں کٹیا بنا دو۔ دنیا والوں سے دور گوشہ نشینی چاہتا ہوں۔ کٹیا بن جائے گی تو کل رات سے میں کٹیا میں بیٹھوں گا۔ میں سمجھ گیا ہوں کہ میری زندگی کے دن پورے ہو گئے ہیں۔ خدا کرے کہ مجھے چلے کے دوران موت آجائے۔"

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئے۔ تینوں بھائی وہاں سے اٹھ کر چلے گئے۔

○☆○

شاداں ایک تکیے کو سینے سے لگائے خوب گہری نیند سوتی رہی۔ صبح آنکھ کھلی تو بدن ٹوٹ رہا تھا۔ گہری نیند کے بعد بھی رات کی تھکن دور نہیں ہوئی تھی۔ اس نے بستر پر لیٹے ہی لیٹے انگڑائی لی۔ ریشمی بدن کھنچ کر کمان ہو گیا۔ انگڑائی لینے سے ذرا آرام آیا۔ تو وہ

مراد کے متعلق سوچنے لگی۔

"وہ کہاں ہو گا؟ پھر کب آئے گا؟"

وہ جاتے جاتے کہہ گیا تھا کہ وہ پھر آئے گا اور بار بار آئے گا۔ کیوں کہ پروانہ جلنے سے اور مرنے سے نہیں ڈرتا۔ یہ تو سب ہی جانتے تھے اور مانتے تھے کہ شاداں بے حد حسین تھی لیکن مراد جیسے نڈر اور سرپھرے کے لیے اس وجہ سے حسین و دل نشین تھی کہ خطرات سے کھیل کر اسے حاصل کرنا پڑتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کسی وقت بھی کوئی دشمن پیچھے سے موت بن کر آسکتا ہے یا وہ قانون کے ہتھے چڑھ کر پھانسی کے پھندے تک پہنچ سکتا ہے۔ اس لیے اس نے موت کی دہشت کو دل سے نکال دیا تھا اور اس میں شاداں کو بٹھا دیا تھا اور اس کے پیار بھرے ہنگامے دشمنوں کو للکار رہے تھے۔

"آؤ تم ظلم کی چھاؤں میں لڑو۔ میں زلفوں کی چھاؤں میں لڑتا ہوں۔ تم مجھے اذیتیں دے کر مارنا چاہتے ہو۔ میں بڑے اطمینان اور خوب صورتی سے مرنا چاہتا ہوں۔ شہر شہر گاؤں گاؤں قانون سے منہ چھپاتے رہنے سے بہتر ہے میں اپنی شاداں کی چاہت میں جان دے دوں۔......"

شاداں بستر پر اوندھی لیٹی زیر لب مسکرا رہی تھی۔ یہ خیال کتنا خوش کن ہے کہ کوئی ہمیں چاہتا ہے اور ہمارے لیے جان کی بازی لگاتا ہے۔ اس نے ایسے ہی جیالے محبوب کے سپنے دیکھے تھے جو اس کے بھائیوں کی طرح دلیر بھی ہو اور درندہ بھی۔ اس کے بھائی دولت کے دیوانے تھے اور وہ محبت میں جل جانے والا پروانہ تھا۔ تب ہی اسے آگ کے شعلوں سے نکال کر لے گیا تھا۔

وہ سوچتی رہی اور کروٹیں بدلتی رہی۔ اتنے میں اس کی چھوٹی بھابی مسکراتی ہوئی کمرے میں آئی اور دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔ چھوٹی بھابی اس کی ایک بے تکلف سہیلی بھی تھی۔ وہ دونوں بند کمرے میں بیٹھی گھنٹوں چٹخارے دار موضوع پر باتیں کرتی رہتی تھیں۔ اب تک بھابی بولتی تھی اور وہ سنتی تھی۔ آج اس کے بولنے اور بھابی کے سننے کی باری تھی۔ بھابی نے پلنگ پر آکر دھپ سے اس کے قریب گرتے ہوئے کہا۔

"اب بتا۔ رات کیا ہوا تھا؟"

"کچھ نہیں۔" وہ شرما کر تکیے میں اپنا منہ چھپانے لگی۔

بھابی نے اس کی پیٹھ پر ایک دھپ مارتے ہوئے کہا۔
"کیسے کچھ نہیں۔ مجھ سے اڑتی ہو۔ ارے یہاں تمام بھابیوں نے تاڑلیا ہے۔ وہ سب تیرے بھائیوں کے ڈر سے خاموش ہیں ورنہ اب تک تجھے چاروں کھونٹ بد نام کردیتیں۔ کل رات جو لوگ زخمی ہوئے تھے تیرے بھائیوں نے انہیں اچھی طرح ڈرایا دھمکایا ہے کہ وہ تیری اور مراد کی ملاقات کا ذکر کسی سے نہ کریں۔ اب وہ بے چارے یہی کہتے ہیں کہ جب مراد سے ان کا مقابلہ ہوا تو وہ تنہا تھا اور تیرے بھائی یہ کہتے پھر رہے ہیں کہ جب کٹیا میں آگ لگی تو وہاں سے بھاگ کر سیدھی حویلی میں آگئی تھی۔ بدحواسی میں کسی نے اسے نہیں دیکھا۔ سب یہی سمجھتے رہے کہ تو نہ جانے کہاں غائب ہو گئی ہے۔ بستی کے سیدھے سادے لوگ اس جھوٹ پر یقین کر رہے ہیں۔ یقین نہ بھی کریں تو کیا کریں۔ کس کی شامت آئی ہے کہ مراد سے تیرا رشتہ جوڑ کر اپنی موت کو دعوت دے گا۔ بہرحال بات دب گئی ہے۔ اس خاندان کی عزت رہ گئی ہے۔ اب چھوڑ ان باتوں کو اپنی بتا کیسا ہے وہ؟"
"میں نے سنا ہے مراد ڈاکو ہے۔ کئی قتل کر چکا ہے۔"
"اس نے تو مجھے قتل کر دیا ہے۔" شاداں لذت انگیز لہجے میں بولی۔
"مگر اس کے بارے میں یہی مشہور ہے۔" بھابی نے دوبارہ کہا۔
"غلط مشہور ہے۔ کوئی میری نظر سے اسے دیکھے۔ وہ پیار کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے جس میں ڈوب جانے کو جی چاہتا ہے۔"
بھابی نے ایک ٹھنڈی سانس لے کہا۔
"تو ٹھیک کہتی ہے۔ یہ مرد پہلے تن کو اچھے لگتے ہیں پھر من کو بھاتے ہیں۔ تیری باتوں سے لگتا ہے کہ تو اس کی دیوانی ہوگئی ہے مگر شاداں! وہ تو جنگل کا شیر ہے۔ بھولے سے بستی کی طرف آگیا تھا۔ اول تو وہ دوبارہ نہیں آئے گا اور آئے گا تو شکاریوں کے نرغے میں پھنس جائے گا۔"
وہ بھابی کا ہاتھ تھام کر بولی۔
"یہی سوچ کر میرا دل گھبراتا ہے۔ وہ اکیلا ہے اور ساری دنیا اس کی دشمن ہے۔ بھابی! خدا کی قسم' اسے کچھ ہوگیا تو میں مرجاؤں گی۔"

"میریں تیرے دشمن۔ تو جتنا اس کے لیے سوچے گی۔ تیری دیوانگی بڑھتی جائے گی دانشمندی یہی ہے کہ جو گزر چکی ہے اسے بھول جا۔ وہی ایک چھیل چھبیلا نہیں ہے روگ وہ تجھے لگ گیا ہے اس کا علاج شادی کے بعد ہو جائے گا۔"

وہ بھابی کا ہاتھ جھٹک کر بولی۔

"ایسی باتیں نہ کرو۔ میرے مراد کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا' کوئی لے سکتا ہے تو بتا کون ہے وہ جو مراد کی طرح موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مجھ سے پیار کرے گا بول ہے کوئی؟

بھابی نے لاجواب ہو کر پوچھا۔

کیا یہی بات تو اپنے بھائیوں سے کہہ سکتی ہے؟"

وہ چپ ہو گئی۔ اس میں اتنی جرات نہیں تھی کہ وہ بھائیوں کے سامنے مراد کی محبت کا دم بھرتی۔ وہ ساتوں اس کی کھال کھینچ کر رکھ دیں گے۔ وہ اپنی بزدلی کو اچھی طرح سمجھ رہی تھی۔ اس کے دل میں بیک وقت محبت بھی تھی اور دہشت بھی۔ مراد آندھی اور طوفان کی طرح اسے اڑا لے جانا چاہتا تھا اور اس کے بھائی حفاظتی بند باندھ رہے تھے نہ تو وہ بندشوں کو توڑنے کی جرات کر سکتی تھی اور نہ ہی مراد کی چاہت سے انکار کر سکتی تھی۔

بھابی اسے بہت دیر تک سمجھاتی رہی اور وہ چپ چاپ سنتی رہی پھر دونوں کمرے سے باہر آگئیں۔ باہر آنے کے بعد جو پہلی خوش خبری سنائی دی وہ یہ تھی کہ مراد ابھی تک گرفتار نہیں ہو سکا۔ رات بھر کے جاگے ہوئے چھ بھائی سو رہے تھے۔ بڑا بھائی ریزیڈنسی کی طرف گیا تھا تاکہ صاحب بہادر کے دفتر میں مراد کے متعلق معلومات فراہم کرے اور اس کی گرفتاری کے لیے سرکار سے کچھ امداد حاصل کرے۔ جانے سے پہلے اس نے گھر کی عورتوں کو تاکید کر دی تھی کہ شاداں کو حویلی سے باہر نکلنا تو دور کی بات ہے۔ انہوں نے اسے کھڑکیوں اور دروازوں تک جانے سے بھی منع کر دیا۔ چھوٹی بھابی اسے باہر کی خبریں پہنچاتی رہی۔ اسے پتہ چلا کہ حویلی کے سامنے سو گز کے فاصلے پر روگی بابا کی نئی قبر بنائی جا رہی ہے تاکہ وہ شام کو بابا کے لیے روٹی لے کر جائے تو حویلی والوں کی نظروں میں رہے۔ اڑتی اڑتی خبر ملی کہ ایک مزدور کھیت میں زخمی ہو گیا ہے۔ تمام بھائی بھاگے بھاگے

جائے وادات پر پہنچے۔ کسی کے زخمی ہونے کا مطلب یہی سمجھا جا رہا تھا کہ مراد پہنچ گیا ہے لیکن وہاں پہنچ کر پتہ چلا کہ فصل کی کٹائی کے دوران دو مزدوروں میں جھگڑا ہو گیا تھا اور ایک نے اپنی درانتی سے دوسرے کو زخمی کر دیا تھا۔ "کھسیانی بلی کھمبا نوچے" کے مصداق تمام بھائیوں نے دونوں مزدوروں کی خوب پٹائی کر دی اور یہ اعلان کر دیا کہ مراد کے ہاتھ آنے تک کوئی ہاتھا پائی نہ کرے۔ ورنہ انہیں سخت سزائیں دی جائیں گی۔

شام ہونے سے پہلے ہی بڑا بھائی ریذیڈنسی سے واپس آگیا۔ اس نے تمام بھائیوں کو اپنے کمرے میں بلا کر کہا۔

"ریزیڈنٹ صاحب ہمارے معاملے میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ اتنے بڑے انگریز افسر مجھ سے بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ پچھلی رات کے تمام واقعات سننے کے بعد انہوں نے بھی وہی بات کہی جو روگی بابا نے کہی تھی۔ یعنی یہ کہ مراد کبھی عورتوں سے دلچسپی نہیں لیتا ہے۔ اس کی ہسٹری شیٹ میں یہی لکھا ہے کہ اس نے قتل کئے ہیں۔ ڈاکے بھی ڈالے ہیں لیکن آج تک کسی کی بہن یا بیٹی کو اٹھا کر نہیں لے گیا ہے۔ اگر وہ شاداں کو اٹھا کر لے گیا ہوتا تو پھر یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ دوبارہ آئے گا کیونکہ شاداں اس کی کمزوری بن گئی ہے۔"

یہ بڑے شرم کی بات ہے کہ ریذیڈنٹ صاحب نے ہماری بہن کے متعلق ایسی بات کہی ہے۔ لیکن سچائی کڑوی ہوتی ہے۔ ہمیں اس کڑواہٹ کو برداشت کرنا ہی پڑے گا ہم اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ وہ شاداں کو چاہتا ہے اسی لیے اسے بدنام نہیں کرنا چاہتا اور بڑی خاموشی سے اسے حویلی تک پہنچا گیا ہے۔

ہم عشق کو ایک حماقت یا بیماری سمجھتے ہیں لیکن عورت اچھے سے اچھے ذہن اور دلیر سے دلیر انسان کو اس بیماری میں مبتلا کر دیتی ہے۔ ریذیڈنٹ صاحب نے فرنگی چال بتائی ہے کہ مراد کو زیادہ سے زیادہ اس بیماری میں مبتلا کیا جائے اور اس کے لیے نہایت سخت انداز میں مشورہ دیا ہے کہ ہم شاداں کو حویلی میں قید نہ کریں بلکہ اسے تنہا گھومنے پھرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیں۔

ایک بھائی نے غصے سے کہا۔

"یہ ریذیڈنٹ صاحب ہمیں بے غیرتی کا سبق سکھا رہے ہیں۔ کیا وہ نہیں جانتے کہ

اس طرح ہماری اور ہمارے خاندان کی کیسی بدنامی ہوگی؟"

دوسرے بھائی نے پوچھا۔ پھر تیسرے نے۔ پھر چوتھے نے۔ سب ہی اس مشورے کی مخالفت کرنے لگے۔ بڑے بھائی نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"پہلے یہ بتاؤ کہ ہم نے یہ عزت' یہ مرتبہ کیسے حاصل کیا ہے؟ ہم یہاں کے جاگیردار اور حاکم بن کر اپنے رعب اور دبدبے سے لوگوں کو مجبور کر دیتے ہیں کہ وہ ہماری عزت کریں۔ یہ برتری' یہ عظمت اور یہ شان و شوکت ہمیں سرکار برطانیہ کی مدد سے حاصل ہوئی ہے۔ تم سب اچھی طرح جانتے ہو کہ حکم عدولی کرنے والوں سے خطابات چھین لیے جاتے ہیں اور انہیں زمینوں سے بے دخل کر دیا جاتا ہے۔ کیا تم اتنی بڑی جاگیر سے محروم ہونا پسند کرو گے؟"

سب ہی کو چپ لگ گئی۔ وہ ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ بڑے بھائی نے کہا۔

"میں نے ان کا مشورہ قبول کر لیا ہے لیکن میں بے غیرت نہیں ہوں۔ اگر سوچنے کا انداز ذرا سا بدل دیا جائے تو غیرت کے معنی میں ذرا سی لچک پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً ہم یہ کیوں نہ سوچیں کہ مراد نے شاداں کو ہاتھ لگا کر ہماری غیرت کو للکارا ہے۔ وہ بزدل دشمن ہے جو چھپتا پھرتا ہے۔ نہ وہ مقابلے پر آئے گا اور نہ ہم انتقام لے سکیں گے۔ اگر ہم اپنی غیرت کا بھرم رکھنا چاہتے ہیں تو کیوں نہ شاداں کو ذرا سی ڈھیل دے کر مراد کو سامنے آنے پر مجبور کریں۔ ہم اسے اتنا موقع ہی نہیں دیں گے کہ وہ دوبارہ شاداں کو ہاتھ بھی لگا سکے۔ بس ایک بار وہ اس سے ملنے کے لیے آجائے پھر ہم اسے گھیر کر کتے کی موت مار دیں گے۔"

بڑے بھائی کا یہ مشورہ قابل قبول تھا۔ سب ایک دوسرے سے رائے لینے لگے۔ آخر کار یہ فیصلہ ہو گیا کہ شاداں پر سے پابندیاں ہٹالی جائیں۔ چھپ چھپ کر اس کی نگرانی کی جائے۔

ٹھیک ہے سوچنے کا انداز بدل جائے تو غیرت کے معنی بھی بدل جاتے ہیں۔ اب بہن کو چارہ بنا کر دشمن پر ہاتھ ڈالنا بے غیرتی نہیں تھی۔ اب غیرت کے معنی یہ تھے کہ کسی طرح دشمن کو گھیرا جائے اور انگریز سرکار کو اپنی فرماں برداری کا ثبوت دیا جائے۔

شام کو شاداں کٹیا کی جانب جانے لگی تو اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس کے ساتھ کوئی ملازمہ نہیں جارہی تھی۔ اس کے بڑے بھائی نے اپنے کمرے میں اسے بلا کر سمجھایا۔

"تم چوہدری برکت علی کی بیٹی ہو اور ہم سب کی غیرت ہو۔ اپنی اور اپنے خاندان کی عزت کو برقرار رکھنا تمہارا فرض ہے۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ ایک قاتل اور بدمعاش تمہارے قدموں میں بھی بیٹھنے کے قابل ہے؟"

"نن..... نہیں۔" وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ بھائی کے سامنے یہ کہنے کی جرات نہ ہوئی کہ میں اس کے قدموں میں رہنا چاہتی ہوں۔"

"اگر وہ تمہیں نظر آیا تو تم کیا کرو گی؟"

"میں اس سے بات نہیں کروں گی۔"

"نہیں۔" بھائی نے کہا۔ "تم اس سے باتیں کرو گی۔" وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ مراد کو اس کے قدموں میں بیٹھنے کے قابل نہیں سمجھا جا رہا تھا مگر اس سے باتیں کرنے کا مشورہ دیا جا رہا تھا۔

"شاداں! جو کچھ میں کہہ رہا ہوں۔ اس پر پوری طرح عمل کرنا۔ وہ جب بھی نظر آئے تو اس سے کسی خاص جگہ اور خاص وقت ملنے کا وعدہ کرلینا۔ ہمیں بتا دینا صرف ایک بار وہ ہمارے گھیرے میں آجائے پھر بچ کر نہیں جائے گا۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ ایسا تم کس لیے کرو گی۔"

"اس لیے کہ آپ حکم دے رہے ہیں۔"

"نہیں۔ تم چاہو تو میرے حکم کو ٹھکرا سکتی ہو۔ اس بدمعاش کے فریب میں آسکتی ہو لیکن جب تمہیں احساس ہوگا کہ تمہاری ایک ذرا سی غلطی سے تمہارے باپ دادا کے ناموں پر حرف آئے گا۔ ہمارے سر شرم سے جھک جائیں گے اور لوگ اس حویلی کی طرف منہ اٹھا کر تھوکیں گے تو تم ایک بدمعاش کو کبھی اہمیت نہیں دو گی۔ کبھی اس کے فریب میں نہیں آؤ گی۔ دیکھو شاداں! میں یہ چاہتا ہوں کہ تم اپنی عزت اور اپنے مرتبے کو سمجھو۔ تم میرے سامنے قسم کھاؤ کہ تم اپنی نادانی سے مراد کو یہ موقع نہیں دو گی کہ وہ تمہارے باپ دادا کی عظمتوں پر کیچڑ اچھال سکے۔"

"میں قسم کھاتی ہوں بھائی جان۔ مجھے اپنے باپ دادا کے ناموں سے صرف محبت ہی نہیں عقیدت بھی ہے۔ میں اپنے خاندان کی عزت اور شہرت پر آنچ نہیں آنے دوں گی۔"

"شاباش۔ اب تم جا سکتی ہو۔ تم پر کسی قسم کی پابندی نہیں لگائی جائے گی۔"

اس نے پانی کی چھوٹی سی مٹکی سر پر رکھی' روٹیوں کا چھابہ اٹھایا اور بھائی کے کمرے سے باہر آ گئی۔

حویلی کے سامنے دور ایک کٹیا نظر آ رہی تھی۔ بانس کی کھپچیوں سے چار دیواری کھڑی کی گئی تھی۔ صرف چھت ڈالنے کا کام رہ گیا تھا۔ وہ نظریں جھکائے کٹیا کی طرف جا رہی تھی۔ ہر قدم پر اس کا دل کچھ محبت اور کچھ خوف سے دھڑک رہا تھا کہ وہ دیوانہ اچانک ہی کہیں سے آئے گا اور اسے اٹھا کر لے جائے گا لیکن وہ نہیں آیا۔

کٹیا کے دروازے پر پہنچ کر اس نے دل کو سمجھایا کہ ابھی وہ کیسے آئے گا۔ ابھی تو کچھ اجالا سا ہے' کچھ کچھ اندھیرا ہے اور وہ لٹیرا تو شب خون مارتا ہے۔ اس نے دستک دی۔ دروازہ کھل گیا۔ کٹیا کے اندر وہی روگی بابا کی کھانسیاں اور نصیحتیں تھیں۔ وہ مراد کے متعلق اسے سمجھا رہے تھے کہ وہ دل کا اچھا ہے مگر تقدیر کا کھوٹا ہے۔ کسی وقت بھی قانون کے شکنجے میں آ سکتا ہے۔

شاداں ان کی باتیں سن رہی تھی اور چھت کی طرف دیکھ رہی تھی۔ چھت نہیں تھی۔ اوپر ایک گھنے درخت کی شاخیں پھیلی ہوئی تھیں۔ اس نے دل ہی دل میں کہا۔ اللہ کرے وہ اس گھنے درخت میں کہیں چھپا ہو اور اچانک دھم سے کود کر کٹیا کے اندر آ جائے لیکن وہ نہیں آیا۔

کٹیا سے واپسی پر اندھیرا ہو چکا تھا۔ وہ شب خون مارنے والا اندھیرے میں بھی نہیں آیا۔ شاداں کی بے چینی بڑھ گئی۔ کھانے کا وقت آیا تو بھوک مر گئی۔ سونے کا وقت آیا تو آنکھوں سے نیند اڑ گئی۔ دوسری صبح چھوٹی بھابی اس کے کمرے میں آئی تو اس سے بھی باتیں کرنے کو دل نہ چاہا۔ وہ اضطراب اور پریشانیاں صرف اس کے ساتھ نہیں تھیں۔ اس کے ساتوں بھائی بھی انتظار کے کانٹوں پر لوٹ رہے تھے۔ ہر صبح' ہر شام یہی کھٹکا لگا رہتا کہ وہ آنے والا ہے۔ وہ کھیتوں میں نظر آئے گا یا کھلیانوں میں۔ گھنے درختوں میں

چھپا ہو گا یا پھر..... یا روگی بابا کی کٹیا میں۔

ہاں پہلے یہ خیال نہیں آیا تا کہ وہ بابا کی کٹیا میں چھپ سکتا ہے۔ بعد میں ایک بھائی نے سوچا۔ تو سب ہی سوچنے لگے۔ ان دنوں صورت حال یہ تھی کہ بابا چلے میں بیٹھ گئے تھے یعنی چالیس دنوں تک کسی کو کٹیا کے اندر جانے کی اجازت نہ تھی۔ صرف شاداں دستور کے مطابق شام کو وہاں کچھ دیر کے لیے جاتی تھی۔ کچھ بھائی ایسے تھے جنہیں شاداں پر اعتماد نہ تھا۔ وہ کہتے تھے کہ جب عورت دیوانی ہوتی ہے تو اپنی آسودگی کے لیے اپنوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر گھر سے نکلتی ہے۔ ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس نے مراد کو کٹیا میں چھپا رکھا ہو۔ مراد ایک قاتل ہے اس نے بابا کو ہلاک کر کے اس کٹیا میں دفن کر دیا ہو گا۔ سب یہی سمجھتے رہ جائیں گے کہ بابا چلہ کاٹ رہے ہیں اور وہ ایک بہن کو اس کے بھائیوں کے رشتے سے کاٹ رہا ہو گا۔

یہ سوچ کر وہ کٹیا میں جھانکنے لگے۔ صبح کو یا آدھی رات کو دو تین بھائی چپکے سے جاتے تھے۔ کبھی دیواروں سے کان لگا کر اندر سے مرد کی آواز سننے کی توقع کرتے تھے مگر کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ وہ اطمینان کے لیے دروازہ کھول کر کئی بار اندر گئے وہاں روگی بابا ہمیشہ تنہا نظر آتے تھے۔ وہ آنکھیں بند کئے مراقبے میں رہتے تھے 'کون وہاں آتا ہے اور جاتا ہے۔ انہیں اس کی خبر نہ تھی۔ وہ اپنی عبادت میں مصروف رہتے تھے۔ بہرحال مراد وہاں نظر نہ آیا۔

چلے کی تیس دن گزر گئے تمام بھائی تیس راتوں تک جاگ جاگ کر بے زار ہو گئے اور اسے گالیاں دینے لگے کہ کم بخت نے سونا جاگنا' کھانا پینا سب حرام کر دیا ہے۔ نہ وہ آتا ہے اور نہ اس کے ملنے کی خبر ملتی ہے۔ شاداں بھی بددل ہو رہی تھی کہ جسے وہ پروانہ سمجھتی تھی وہ بھونرا بن کر آیا تھا اور رس چوس کر چلا گیا۔

وہ سوچتی تھی اور تکیے میں منہ چھپا کر روتی تھی۔

پھر ایسا ہوا کہ ایک صبح اس کا منجھلا بھائی کسی کام سے جہلم کی طرف گیا اور شام کو اپنے دو ملازموں کے ساتھ زخمی حالت میں واپس آیا۔ اس نے بتایا کہ وہاں سے تقریباً پچاس میل دور مراد سے سامنا ہو گیا تھا۔ مراد سے ان کا زبردست مقابلہ ہوا۔ منجھلا بھائی اور دونوں ملازم بری طرح زخمی ہوئے تھے لیکن ان کا بیان تھا کہ مراد ان سے زیادہ زخمی

ہوا ہے اور بزدلوں کی طرح میدان چھوڑ کر بھاگ گیا ہے۔

اس واقعہ سے تمام بھائیوں کو یقین ہو گیا کہ وہ اس علاقہ سے دور چلا گیا ہے۔ اس پر سات بھائیوں کی وہشت اس قدر طاری ہے کہ وہ بیک وقت ساتوں سے نمٹنے کے لیے بستی کی طرف آنے کی جرات نہیں کرے گا۔ اس علاقے سے دوران میں سے کسی کو تنہا دیکھ کر ہی مقابلے کے لیے للکارے گا۔

پھر وہ راتوں کو اطمینان سے سونے لگے۔ دو چوکیدار تمام رات حویلی کے چاروں طرف چکر لگاتے رہتے تھے اور "ہوشیار' جاگتے رہو۔" کی صدائیں بلند کرتے ہوئے اپنے آقاؤں کو یقین دلاتے تھے کہ وہ بڑی مستعدی سے پہرہ دے رہے ہیں۔

پہرہ مضبوط تھا۔ بھائی مطمئن تھے۔ شاداں اپنے محبوب کی بے وفائی اور سنگ دلی پر آنسو بہا رہی تھی۔ ایسے ہی وقت وہ آ گیا۔

آدھی رات گزر چکی تھی۔ روگی بابا سر پر کمبل اوڑھے مراقبے میں بیٹھے تھے۔ کچھ پڑھ رہے تھے یا اونگھ رہے تھے۔ چراغ کی بجھتی ہوئی روشنی میں وہ آہستہ آہستہ چھپتے جا رہے تھے۔ اندھیرے کی کالی چادر انہیں اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی۔ پھر اس سے پہلے کہ چراغ بجھ جاتا اور کٹیا تاریکی میں ڈوب جاتی۔ وہ آہستگی سے دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔

اس کے بھاری بھرکم بوٹ کیچڑ میں سنے ہوئے تھے۔ چست پتلون ایک آدھ جگہ سے پھٹی ہوئی تھی۔ قمیص میلی چیکٹ ہو گئی تھی۔ اس کی اصلی رنگت کا پتہ نہیں چلتا تھا۔ اس کے شانے سے کارتوس کی پٹی اور دوسرے شانے سے ایک رائفل لٹک رہی تھی۔ داڑھی اور سر کے بال وحشیوں کی طرح بڑھے ہوئے تھے۔ نتھنے سانسوں کی ہلچل سے پھڑک رہے تھے اور آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔

اس نے دروازے کو اندر سے بند کیا۔ پھر روگی بابا کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کے قدموں کی دھمک سے کٹیا کا فرش دہل رہا تھا۔ اس نے دھیمی سرگوشی میں کہا۔

"بابا۔ میں یہاں پناہ لینے آیا ہوں۔"

بابا کی آنکھیں کھل گئیں۔ چراغ بجھ گیا۔ دونوں کے چہرے تاریکی میں چھپ گئے۔ تب بابا نے ایک طویل سانس چھوڑتے ہوئے۔ "ہاں" کہا۔ وہ ہاں ایسی تھی جیسے

سینے سے آہ نکل رہی ہو۔

"ہاں۔ تم آگئے۔ میں ایک مدت سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ میں جانتا تھا کہ تم آؤ گے۔ تمہارا نام سنتے ہی میں چلے میں بیٹھ گیا تھا۔ صرف دکھاوے کے لیے۔ میں کوئی خاص عمل کرنا نہیں جانتا۔ وظیفہ پڑھنا نہیں جانتا۔ میری بزرگی ایک دکھاوا ہے لیکن میری عبادت میں کوئی کھوٹ نہیں ہے۔"

میں اٹھارہ سال سے سجدے کر رہا ہوں۔ خداوند کریم سے اپنے گناہوں کی معافی مانگ رہا ہوں۔ میری گوشہ نشینی صرف اس لیے تھی کہ تم مجھے تلاش نہ کر سکو۔ مراد! میں وہی سلامت بیگ ہوں جو تمہاری معصوم بہن کو اٹھا کر ایڈی کانگ دھرم کے بنگلے پر لے گیا تھا۔"

کھوں...... کھوں...... کھوں...... اندھیرا کھانسنے لگا۔ اندھیرا چکرانے لگا۔ مراد کا سر گھومنے لگا۔ اس نے شانے پر سے رائفل اتاری۔ اس کی غراہٹ تاریکی کے سینے میں خنجر کی طرح اتر رہی تھی۔ اس نے رائفل کی نال کو دونوں ہاتھوں سے پکڑا اور اسے شانے سے بلند کیا لیکن پھر حملہ کرتے کرتے رک گیا کیوں کہ دشمن کھانس رہا تھا' کراہ رہا تھا۔ شاید بیمار تھا اور مراد کی مردانگی یہ گوارا نہیں کرتی تھی کہ کمزور اور بیمار دشمن کو کسی ہتھیار سے مارے لیکن اسے مارنا بھی لازمی تھا جس کی تلاش میں وہ اٹھارہ سال سے بھٹک رہا تھا۔ اسے کسی صورت میں معاف نہیں کر سکتا تھا۔

اس نے تاریکی میں رائفل کے کندے سے اسے ٹٹولا پھر اس کے شانے پر اپنا ایک پاؤں رکھ دیا بھاری پاؤں۔ وزنی بوٹ اور کچل ڈالنے کی ضد۔ سلامت بیگ کی کمزور ہڈیاں کڑکڑانے لگیں۔ وہ کراہتے ہوئے بیٹھے ہی بیٹھے فرش پر گر پڑا۔ مراد نے ہولے سے ایک ٹھوکر ماری' وہ چت ہو گیا۔ اب اس کا کیچڑ آلود بوٹ کھانسیوں کے لرزتے ہوئے سینے پر رکھا تھا۔

"آہ۔ مجھے مرنے کا غم نہیں ہے۔ میں تو بہت پہلے تمہارے ہاتھوں سے مرجانا چاہتا تھا۔ میں نے اپنی بہن کا ڈولا اٹھانے کے لیے تمہاری بہن کا سودا کیا تھا۔ اس وقت میں نہیں جانتا تھا کہ تم اتنے خونخوار درندے بن جاؤ گے بعد میں احساس ہوا کہ میں نے اپنی بہن کی اور سارے کنبے کی موت کا سامان کیا ہے۔

آہ مگر تم نے مجھ پر احسان کیا۔ تم نے میرے گھروالوں پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ تم صرف مجھے تلاش کر رہے تھے۔ بنگش کے تھانیدار نے میری بہن کو بحفاظت اس کی سسرال پہنچانے کے لیے دو مسلح سپاہی براتیوں کے ساتھ بھیجے تھے۔ وہاں سے سات میل دور میراں بی بی کے چشمے کے قریب تم نے دونوں سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ باراتی میری بہن کی ڈولی چھوڑ کر ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ تم نے ہوائی فائر کئے اور انہیں للکار کر کہا۔ "رک جاؤ! میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔ سلامت بیگ کی بہن' میری بہن ہے۔ یہ ڈولی ان ڈوگرا سپاہیوں کی حفاظت میں نہیں جائے گی جو مسلمان عورتوں کی عزت سے کھیلتے ہیں۔"

یہ کہہ کر تم گھوڑے سے اتر گئے' ڈولی کے قریب آئے اپنے جیب سے مٹھی بھر چاندی کے زیورات نکالے اور میری بہن سے کہا۔ "میری بہن نے اپنی عزت دینے سے پہلے اپنی جان دے دی۔ یہ زیورات نہیں ہیں۔ ایک بھائی کی محنت اور محبت ہے جو اس کی ڈولی میں جانے والے تھے۔ اب تمہاری ڈولی میں جائیں گے۔

تم نے وہ زیورات میری بہن کی گود میں رکھ دیے۔ آگے جاکر ڈولی کو کاندھا دیا۔ چار فرلانگ تک ڈولی اور براتیوں کے ساتھ گئے پھر اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر کہیں چلے گئے۔

یہ باتیں جب میں نے سنیں تو شرم سے زمین میں گڑ گیا۔ اس وقت میرے ضمیر نے مجھے کیسے کیسے ملامت کی' میں بیان نہیں کر سکتا۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ تمہارے سامنے چلا جاؤں۔ ایک بے غیرت کی طرح زندہ رہنے سے بہتر تھا کہ تمہارے ہاتھوں مر جاؤں اور تمہارے انتقام لینے کی حسرت پوری کر دوں۔ پھر میرے دل نے کہا کہ تم سے پہلے میں خدا کے حضور توبہ کیوں نہ کروں اپنے گناہوں کی معافی کیوں نہ مانگوں۔

ہاں میں مرنے سے پہلے اپنی عاقبت سنوارنا چاہتا تھا۔ جتنے گناہ کئے تھے ان سے زیادہ نیکیاں کرنا چاہتا تھا اور اپنا بیشتر وقت یاد الٰہی میں گزارنا چاہتا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم مجھے کہاں تلاش کرتے پھر رہے ہو۔ ویسے اب میں تم سے دہشت زدہ نہیں تھا۔ صرف تم سے دور رہ کر زیادہ سے زیادہ عبادت اور نیکیاں حاصل کرنے کی مہلت چاہتا تھا۔ اس لیے سیکڑوں میل کا فاصلہ طے کر کے یہاں چلا آیا۔ مجھے کچھ حکیمی نسخے معلوم ہیں کچھ

جڑی بوٹیوں کے متعلق بھی جانتا ہوں۔ میں نے یہاں بیٹھ کر کتنے ہی مریضوں کا علاج کیا ہے۔ پہلے پہل سب ہی میرا نام پوچھتے تھے اور میں خود کو ایک گمنام' خدا کا بندہ کہتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میرا نام یہاں سے اچھل کر تمہارے کانوں تک پہنچ جائے۔ میں روگ جانتا ہوں اور علاج کرتا ہوں۔ اس لیے لوگ مجھے روگی بابا کہتے ہیں۔ شاید اس لیے بھی کہتے ہیں کہ میں دوسروں کا علاج کرتا ہوں اور خود بیمار رہتا ہوں۔"

کوئی نہیں جانتا کہ مجھے کیا بیاری ہے۔ یہ تمہاری معصوم بہن کی بد دعائیں ہیں۔ جو مجھے اندر ہی اندر دیمک کی طرح چاٹ رہی ہیں۔ اٹھارہ سال کی عبادتوں کے دوران ہر سجدے میں' میں نے کھوٹ محسوس کیا۔ ابھی میں نے کہا تھا کہ میری عبادت میں کھوٹ نہیں ہے مگر اب اعتراف کرتا ہوں کیوں کہ میں خدا کو سجدہ کرتا تھا اور تم سے ڈرتا تھا۔ حالانکہ صرف خدا سے ڈرنا چاہیے۔ عبادت چوروں کی طرح چھپ کر نہیں کی جاتی لیکن گوشہ نشینی اور چلے کاٹنے کے بہانے چھپتا رہا۔ لب پر خدا کا نام اور دل میں تمہاری دہشت۔ آہ..... اٹھارہ سال کی عبادت پانی ہو گئی۔"

مراد نے غرا کر کہا۔

"ہوں۔ تو تم اٹھارہ سال سے گلتے سڑتے' کراہتے' خون تھوکتے اور ہر لمحے میرے انتظار میں مرتے رہے ہو۔ تم مجھ سے چھپتے رہے مگر خدا کے غضب کو اپنی عبادتوں سے بہلا نہ سکے۔ وہ جزا اور سزا کو سمجھنے اور برتنے والا تمہیں ایک مدت سے سزائیں دے رہا ہے۔ میں اب تمہیں کیا سزا دے سکتا ہوں۔ کچھ نہیں......"

اس نے سلامت بیگ کے سینے پر سے پاؤں ہٹا کر جیب سے دیا سلائی نکالی اور تیلی کو روشن کیا۔ اس کی روشنی میں سلامت بیگ ایک لاش کی طرح فرش پر پڑا نظر آیا۔ اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں' پچکے ہوئے رخسار' ابھری ہوئی ہڈیاں اور لانبی سفید داڑھی۔ وہ ایک مقدس بزرگ کا چہرہ تھا۔ تصویر کا دوسرا رخ سامنے آتے ہی مکروہ ہو گیا۔ وہ رحم طلب نظروں سے مراد کو دیکھ رہا تھا۔ مراد نے دوسری تیلی روشن کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ تم خدا سے زیادہ مجھ سے ڈرتے رہے ہو۔ کتنے احمق ہو اگر میں تمہیں مارتا تو ایک ہی وار میں ختم کر دیتا۔ ڈرنا تو اس سے چاہیے جو سزائیں دینے کا سلیقہ جانتا ہے اور ایک مدت سے تمہیں ایک ایک چٹکی موت دے رہا

ہے۔ جاؤ میں نے تمہیں معاف کیا۔ تمہیں خوف و دہشت سے آزاد کیا۔ میں تمہیں نہیں ماروں گا۔"

"آں" اس کا منہ حیرت سے کھل گیا کہ جابر دشمن اسے نہیں مارے گا۔"

اس کے دیدے مسرت سے پھیل گئے کہ برسوں کی اذیت سے نجات مل گئی ہے۔

اسے معافی مل گئی تھی۔ وہ آزاد ہو گیا تھا۔ موت اس سے دور ہو گئی تھی۔ ان مسرتوں کے ہجوم میں اس کا بیمار دل تیزی سے دھڑکنا چاہتا تھا مگر اس کا دھڑکنا اچانک ہی بند ہو گیا۔ مارے خوشی کے اس کا دم نکل گیا تھا۔

"سلامت بیگ، اٹھو اور سجدہ شکر ادا کرو۔"

وہ ساکت پڑا رہا۔

مراد نے تیسری تیلی روشن کی اور اس پر جھک کر اسے ٹٹولنے لگا۔

تیلی جل رہی تھی اور زندگی بجھ گئی تھی۔ کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو برسوں موت کے خوف سے جیتے رہتے ہیں اور زندگی کا مژدہ سنتے ہی مر جاتے ہیں۔ الاؤ کو پھونکو تو آگ بڑھتی ہے۔ تیلی کو پھونکو تو آگ بجھ جاتی ہے۔ پھونکنے کا عمل ایک جیسا ہوتا ہے۔ صرف مقام کا فرق ہوتا ہے۔ مراد اس فرق کو نہ سمجھ سکا۔ اس نے ہمدردی کی اور اس کے تیلی جیسے ڈھانچے کو پھونک کر رکھ دیا۔

رات گزر گئی۔ دوسرا دن بھی گزرنے لگا۔ تیسرا بھائی بستی کے ایک کچے راستے سے گزرتا ہوا حویلی کی طرف جا رہا تھا۔ چوپال کے قریب سے گزرتے ہی شاداں کا نام سن کر ٹھٹک گیا۔ چند نوجوان چوپال میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک کہہ رہا تھا۔

"بڑے گھر کی عورتیں ہزار بار منہ کالا کریں پھر بھی ان کے چہرے کی کالک چھپ جاتی ہے شاداں کو دیکھو۔ وہ مراد سے کھیل چکی ہے مگر حویلی کی طرف منہ اٹھا کر سچی بات کہنے کی کسی کو جرات نہیں ہے۔"

اتنا سنتے ہی تیسرا بھائی گرجتا ہوا چوپال میں گیا اور اس نوجوان کا گریبان پکڑ کر کھینچتا ہوا باہر لے آیا۔ نوجوان اس سے کمزور نہیں تھا۔ لہٰذا دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ دوسرے لوگ بیچ بچاؤ کرنے لگے۔ ذرا سی دیر میں یہ خبر دور دور تک پھیل گئی۔ باقی چھ بھائی دیکھتے ہی دیکھتے اپنے مسلح ملازموں کے ساتھ وہاں پہنچ گئے اور اس نوجوان کو لاتوں گھونسوں سے

مارنے لگے۔ نوجوان مار کھا کر چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔

"تم سب مجھے مار سکتے ہو۔ اس لیے کہ میں اکیلا ہوں مگر تم مجھ پر ظلم کر کے سچائی کو نہیں چھپا سکو گے اگر تم بہادر ہو اور سچے ہو تو پہلے میری بات سنو......"

اس کی جرات دیکھ کر دوسرے نوجوان اس کی حمایت میں چیخنے لگے۔ بوڑھوں میں سے ایک نے بڑے بھائی کو مخاطب کیا۔

"چوہدری۔ اس کی بات سن لے۔ تو سچا ہے تو تیری پگڑی کا شملا اونچا ہی رہے گا۔"

بڑے بھائی نے ہاتھ اٹھا کر اپنے بھائیوں کو مار پیٹ سے روک دیا اور کہا۔

"جو آسمان کی طرف منہ اٹھا کر تھوکتا ہے' وہ تھوک اسی کے منہ پر آتا ہے۔ اس پاگل سے کہو کہ ہماری معصوم بہن پر الزام لگا رہا ہے تو اس کا ثبوت بھی پیش کرے اگر یہ الزام بے بنیاد ہوا تو ہم اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

نوجوان نے چوتھے بھائی طرف انگلی اٹھا کر کہا۔

تمہارے اس بھائی نے نازو جیسی غریب لڑکی پر الزام عائد کیا تھا اور تم سب بھائیوں نے بغیر کسی ثبوت کے اس غریب کو بستی سے باہر نکال دیا تھا۔"

"میرا بھائی عینی شاہد ہے۔" بڑے چوہدری نے جواب دیا۔ "اس نے نازو کی بے حیائی کا تماشہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔"

"میں بھی عینی شاہد ہوں۔ نوجوان نے چیخ کر کہا۔ "میں نے بھی تمہاری بہن کی بے حیائی کا تماشا......"

بات پوری ہونے سے پہلے ہی ایک بھائی نے بندوق کے کندے سے اس کے سر پر ضرب لگائی۔ پھر سب ہی اپنی بہن کو بدنام کرنے والے پر خونخوار درندوں کی طرح ٹوٹ پڑے۔

ان کے ملازمین لوگوں کو ہانک ہانک کر دور بھگانے لگے۔ اچھی خاصی بھگدڑ مچ گئی۔ ذرا سی دیر میں ان بھائیوں نے اس نوجوان کا قیمہ بنا کر رکھ دیا۔ پھر وہ چاروں طرف گھوم کر کہنے لگے۔

"پنڈ والو! اچھی طرح سن لو اور سمجھ لو۔ ہمارے خاندان کی کسی بہو بیٹی نے کوئی ایسا کام نہیں کیا جس سے ہمارے سر جھک جائیں۔ ہم نے شاداں کو پھول کی طرح رکھا ہے

اور کانٹوں کی طرح اس کی نگرانی کرتے ہیں۔ اس کے باوجود ہم یہ کہتے ہیں کہ اگر شاداں سے کوئی غلطی ہوئی ہو تو ہم اسے زندہ جلا دیں گے اور ہم بھی بے غیرتوں کی طرح زندہ نہیں رہیں گے کہیں جا کر ڈوب مریں گے۔ ہم نے اپنے آباؤاجداد سے یہی سیکھا ہے کہ عزت کے لیے جیو اور عزت کے لیے مر جاؤ۔"

یہ کہہ کر وہ سب حویلی کی طرف چلے گئے۔ نوجوان کی لاش کے قریب اس کے گھر والے رونے، پیٹنے لگے۔ دوسرے عبرت حاصل کر رہے تھے اور اپنے کانوں کو چھو کر صدق دل سے کہہ رہے تھے کہ شاداں عزت دار لڑکی ہے اور کسی ثبوت کے بغیر کوئی اس کے بھائیوں پر کیچڑ اچھال نہیں سکتا۔"

شاداں...... شام ڈھلے روٹیوں کا چھابہ اور پانی کی مٹکی لے کر حویلی سے نکلتی تو دور بستی میں ویرانی سی نظر آتی۔ شام کی خاموشی میں کسی گھر سے رونے پیٹنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ سمجھ گئی کہ اسے بدنام کرنے والے نوجوان کی لاش پر ماتم کیا جا رہا ہے۔ سات بھائیوں کی اکلوتی بہن کو بدنام کرنے والوں کا کیا حشر ہوتا ہے۔ یہ ساری بستی والے دیکھ چکے تھے۔ شاداں کی گردن فخر سے تن گئی۔ اس کی چال میں شہزادیوں کا سا وقار اور تمکنت پیدا ہو گئی۔ اس کی بستی میں جتنے لوگ تھے سب زمین کے کیڑے تھے جو ہر وقت اس کے قدموں تلے روندے جا سکتے تھے۔

چلتے چلتے مراد کا خیال آیا تو اس کے غرور کو ٹھیس پہنچی۔ اب اس کے خیال سے دل پہ چوٹ لگتی تھی۔ کم بخت کھلونا سمجھ کر بلکہ ایک معمولی لڑکی سمجھ کر اس سے کھیل گیا تھا اور پلٹ کر نہیں آیا تھا۔ اب اس کی بڑی توہین اور کیا ہو سکتی تھی کہ وہ اسے ذرہ برابر اہمیت نہیں دے رہا تھا اور اس کے بھائی اس کے لٹیرے سے انتقام لینے میں ناکام رہے تھے۔

اونہہ! بھگوڑا بزدل۔ میرے بھائیوں کے ہتھے چڑھ جائے تو اس کا قیمہ بنا دیں گے۔ بھائی جان ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ وہ میری عزت کا دشمن تھا۔ دشمنی کر کے چلا گیا۔ اب کہیں نظر آ جائے تو میں اپنے بھائیوں کو ضرور بتاؤں گی کہ وہ مجھ سے کہاں ملنا چاہتا ہے......

اس نے دروازے پر آ کر دستک دی تو پتہ چلا کہ اندر سے بند نہیں ہے۔ اس نے دروازے کو کھولا۔ کٹیا میں رات کا اندھیرا آہستہ آہستہ آنکھیں کھول رہا تھا اور جہاں بالا

بیٹھا کرتے تھے وہاں کوئی سر پر کمبل ڈالے بیٹھا ہوا تھا۔ شاداں نے آگے بڑھ کر کہا۔

"معلوم ہوتا ہے چراغ کا تیل ختم ہوگیا ہے۔ میں ابھی تیل ڈال کر جلاتی ہوں۔"

اس نے پانی کی مٹکی اور روٹیوں کا چھابہ ایک طرف رکھ دیا اور چراغ جلانے کے لیے آگے بڑھی۔ مراد نے کمبل کو ایک طرف پھینک دیا اور اٹھ کر اس کے قریب آیا۔ شاداں کی پشت اس کی جانب تھی۔ وہ اسے اٹھتے ہوئے نہ دیکھ سکی۔ مراد نے اس کا بازو پکڑ کر کھینچ لیا اور اسے اس طرح سینے سے لگا کر بازوؤں میں جکڑ لیا کہ وہ چیخ بھی نہ سکی۔ اس کی سانسیں رک رہی تھیں۔ گھبراہٹ طاری ہو گئی تھی کہ نہ جانے کون ہے؟ اس کٹیا میں نہ نجانے کون ہے؟ اس کٹیا میں بابا کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہوتا لیکن بابا تو ہڈیوں کا ڈھانچہ ہیں اور یہ گوشت پوست کا پہاڑ ہے۔ اس کی مضبوط گرفت کچھ جانی پہچانی ہے۔ یہ وہی سانسوں کی غراہٹیں ہیں جن کی زد میں آکر میں تھرا جاتی ہوں۔ آہ! یہ سانسیں میرے چہرے پر جھک رہی ہیں۔ میرے لبوں پر سلگ رہی ہیں۔ ہاں یہ..... انداز اسی کا ہے۔ یہ وہی ہے' یہ وہی ہے....."

"ہائے نامراد!" اس نے تڑپ کر اپنی گداز بانہیں اس کی گردن میں حمائل کر دیں اور لپٹ لپٹ کر اور مچل مچل کر کہنے لگی۔ "ہائے میں مرجاؤں' تو کہاں چلا گیا تھا۔ بے درد! تیرے سینے میں دل ہی نہیں پتھر ہے' تو تڑپنا نہیں جانتا مگر مجھے تڑپاتا رہتا ہے میں تجھ سے نہیں بولوں گی۔ تو بے وفا ہے' ہرجائی ہے۔ میں تجھے پیار نہیں کروں گی....."

وہ شکایت کر رہی تھی اور گلے لگ رہی تھی۔ اس لیے بولنا نہیں چاہتی تھی اور بول رہی تھی۔ اس سے ناراض تھی اور اسے پیار کیے جا رہی تھی۔ پھر مراد نے کہا۔

"آہستہ بول شاداں' تیری آواز باہر تک جا رہی ہے۔"

تب وہ چونکی۔ اسے ہوش آیا کہ وہ کٹیا میں ہے اور اس کے سامنے اس کے بھائیوں کا دشمن اور اس کے دل کی دھڑکن موجود ہے۔ وہ دوڑتے ہوئے دروازے کے پاس آئی اسے اندر سے بند کیا پھر اس طرح بھاگتے ہوئے واپس آکر اپنے محبوب کی آغوش میں سما گئی۔

کتنی راتیں جاگنے اور تڑپنے کے بعد وہ ملا تھا۔ بابا نے ایسی اذیتوں سے چلہ نہیں کاٹا ہوگا جیسے وہ اس کے انتظار میں کاٹ چکی تھی۔ اس نے سرگوشی میں پوچھا۔

"بابا کہاں ہیں؟"

مراد پیار کے رنگین لمحات میں اسے موت کی خبر نہیں سنانا چاہتا تھا۔ اس نے جواب دیا۔

"وہ یہاں نہیں ہیں۔ یہاں صرف ہم اور تم ہیں۔ ابھی ہم اپنی باتیں کریں گے۔ بابا کی باتیں پھر ہوتی رہیں گی۔"

وہ مان گئی۔ منہ زور جذبات نے منوالیا۔ وہ اپنی باتیں کرنے لگے۔

آنکھوں سے اور سانسوں سے۔ صرف آنکھیں ایک دوسرے کو دیکھ رہی تھیں۔ باقی تمام حواس بڑھ بڑھ کر بول رہے تھے اور ایک دوسرے کو جذبوں کی سماعت سے سن رہے تھے۔

تاریکی میں کبھی چوڑیاں کھنکتی تھیں۔ "مراد! یہ چوڑیاں ہر رات کروٹ کروٹ تجھے پکارتی تھیں آخر تو آہی گیا۔"

اندھیرے میں کبھی کبھی وہ غراتے ہوئے دھیمی سرگوشی میں بولتا تھا۔ "میں جنگلوں اور پہاڑوں میں بھٹکتا ہوں اور پتھروں پر سوتا ہوں تو تیرے جسم کا ملائم بچھونا یاد آتا ہے۔ کسی شکار کو بھون کر کھاتا ہوں تو تیرے جسم کی بوٹی بوٹی میرے دانتوں میں گھلتی ہے۔"

"سچ مراد۔ کیا تو مجھے یاد کرتا ہے۔؟"

"ہاں تو آرام دہ بستر پر یاد کرتی تھی۔ میں خطرات سے الجھ الجھ کر تجھے یاد کرتا تھا۔ تجھ میں کتنا نشہ ہے۔ شاداں میں تجھے بھلانا چاہتا ہوں تب بھی نہیں بھلا سکتا۔ دیکھ لے! اپنی موت کی پروا کئے بغیر تجھ سے ملنے چلا آیا۔"

"ہائے تو کتنا دلیر ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تو میرا دیوانہ ہے لیکن مراد ایک بات سے ڈرتی ہوں کہ اس دیوانگی میں کہیں تو مجھے بدنام نہ کردے۔ کیا تو مجھے بدنام کرے گا؟ کیا تو چاہے گا کہ تیری شاداں کی عزت خاک میں مل جائے؟"

مراد نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔

میں اکثر یہی سوچتا ہوں کہ تجھے ہمیشہ کے لیے کس طرح اپناؤں۔ میں ایک اشتہاری مجرم ہوں تجھے عزت آبرو سے بیاہنے آؤں گا تو گرفتار ہو جاؤں گا اور تیرے بھائی کبھی تجھے میرے حوالے نہیں کریں گے۔ میں نے بارہا سوچا ہے کہ تجھے جبراً یہاں سے لے جاؤں

مگر کہاں لے جاؤں ۔ میرا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ میں قدم قدم پر خطرات کا سامنا کرتا ہوں۔ تو نازو نعم میں پلی ہے۔ نازک مزاج ہے۔ یہ مصائب برداشت نہیں کرسکے گی۔"

نہیں مراد میں تجھے اتنا چاہتی ہوں کہ تیرے ساتھ آگ اور خون کے دریاؤں سے گزر سکتی ہوں لیکن میں باپ دادا کے نام پر دھبہ لگا کر یہاں سے نہیں جانا چاہتی۔ میری باتوں کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ محبت کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ہم اپنے بزرگوں پر کیچڑ اچھالیں اور برسوں کی بنائی ہوئی عزت کو مٹی میں ملادیں۔"

مراد کوئی جواب نہ دے سکا۔ خاموشی سے سوچتا رہا۔

"تو خاموش کیوں ہے؟ بولتا کیوں نہیں؟ کیا تو نہیں چاہتا کہ میں اپنی بستی میں عزت سے رہوں؟"

"چاہتا ہوں۔" اس نے آہستگی سے کہا۔ "میں رات کے اندھیرے میں ایک لٹیرے کی طرح آتا ہوں اور تو بڑی محبت اور مسرت سے اپنا سب کچھ میرے حوالے کر دیتی ہے۔ میں تیری محبت کا صلہ یہی دے سکتا ہوں کہ تجھے دن کے اجالے میں رسوانہ ہونے دوں۔ تیرے دل کو صدمہ پہنچے گا تو مجھے سب سے زیادہ تکلیف ہوگی۔"

وہ خوشی سے لپٹ کر بولی۔

"تو کتنا اچھا ہے مراد۔ بس میں یہی چاہتی ہوں کہ اپنی جاگیر میں فخر سے گردن اونچی کر کے چلوں۔

میرے بھائی مجھ پر انگلی اٹھانے والوں کو جہنم میں پہنچا دیتے ہیں۔ ہماری وہی عزت ہے جو ہمیشہ سے رہی ہے اگر تو چاہے تو آیندہ بھی ہماری عزت بنی رہے گی۔"

"عشق اور مشک کبھی نہیں چھپتے شاداں۔ اگر ہم اسی طرح ملتے رہے تو ہمارے نہ چاہنے کے باوجود بدنامی پھیل جائے گی۔"

"بدنامی نہیں ہوگی۔ اگر روگی بابا مجھے......" وہ کہتے کہتے رک گئی۔ اسے روگی بابا یاد آگئے اس نے پوچھا۔ "تو نے بتایا نہیں کہ بابا کہاں ہیں؟"

"وہ مرچکے ہیں۔"

"کیا؟" وہ حیرت سے بولی۔ "تو تو نے یہاں چھپنے کے لیے انہیں مار ڈالا ہے۔"

"نہیں۔ میں نے انہیں نہیں مارا ہے۔ ان کے دن پورے ہوگئے تھے۔ وہ مر

گئے۔"

"تیری قسم شاداں۔ میں ڈنکے کی چوٹ پر قتل کرتا ہوں۔ کسی سے نہیں ڈرتا۔ مجھ تجھ سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ تو ہی بتا کیا میں ایک بوڑھے اور کمزور انسان پر ہاتھ اٹھا سکتا ہوں؟"

"وہ قائل ہو کر بولی۔

"ان کی لاش کہاں ہے؟"

"میں نے اسی کٹیا کے کونے میں دفن کر دیا ہے۔"

"اوہ!" وہ بڑے دکھ سے بولی۔ "تم نے یہ اچھا نہیں کیا۔ وہ بہت بڑے بزرگ تھے۔ میرے محسن تھے انہیں عزت اور احترام سے دفن کرنا چاہیے تھا۔ پنڈ والے کیا کہیں گے۔"

"اگر میں عزت اور احترام کے لیے تمہارے بھائیوں کو بلاتا تو اس وقت میں کہاں ہوتا۔ کیا تم مجھ سے مل سکتی تھیں۔"

"کچھ بھی ہو مراد۔ یہ اچھا نہیں کہ وہ خاموشی سے دفن ہو جائیں۔ یہاں ان کا مزار ہونا چاہیے۔

"تو پھر مزار بنالو۔ میں یہاں سے جاتا ہوں۔ تم اپنے بھائیوں سے کہہ دینا کہ میں یہاں آیا تھا اور بابا کو دفن کر کے چلا گیا۔

"نہیں" وہ مراد سے لپٹ گئی۔ "میں تمہیں نہیں جانے دوں گی۔ تم جاؤ گے تو نہ جانے پھر کب ملو گے مگر...... آج چالیس دن پورے ہو گئے ہیں۔ کل سب لوگ بابا سے ملنے آئیں گے۔ تم یہاں کس طرح رہ سکتے ہو؟"

"میں نے سب کچھ سوچ لیا ہے۔ تم اپنے بھائیوں سے کہنا کہ بابا مزید چالیس دن تک ایک وظیفہ پڑھیں گے۔ اس وظیفہ کی تاثیر یہ ہے کہ چالیسویں دن مراد ہاتھ باندھے خود کو گرفتاری کی لیے پیش کرنے یہاں آجائے گا۔"

شاداں حیرت سے اندھیرے میں گھورنے لگی۔ اسے مراد نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ ابھی تک ایک دوسرے کو چھو کر، سن کر پہچان رہے تھے۔ شاداں نے کہا۔

"نہ جانے کتنی دیر ہو گئی ہے۔ میں چراغ جلاتی ہوں۔ مجھے اب واپس جانا چاہیے"

نہیں تو بھائیوں کو شبہ ہو جائے گا۔"

مراد نے ماچس کی تیلی روشن کی۔ شاداں مٹی کے تیل کی بوتل اٹھا کر چراغ میں ڈالنے لگی۔

لیکن چراغ کو روشن کرنے میں کافی دیر ہو گئی تھی۔ ورنہ روز کا یہی معمول تھا کہ وہ کٹیا میں داخل ہونے کے بعد پہلے چراغ جلاتی تھی۔

حویلی میں بڑا بھائی تھانیدار سے باتیں کر رہا تھا۔ اس کمرے میں اس کے تین بھائی اور تھے۔ سب ہی اس مسئلے پر گفتگو کر رہے تھے کہ جس نوجوان کو انہوں نے مارا ہے اسے حادثاتی موت کس طرح قرار دیا جا سکتا ہے۔ بڑا بھائی کھڑکی کی جانب رخ کئے بیٹھا تھا۔ کھڑکی کے پار تقریباً سو گز کے فاصلے پر وہ کٹیا تھی۔ جو اندھیرے میں صاف طور پر نظر نہیں آتی تھی لیکن شام کو چراغ جلتے ہی اس کی روشنی بتا دیتی تھی کہ شاداں وہاں پہنچ گئی ہے۔

بڑے بھائی نے بڑی بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے اپنے ایک بھائی سے پوچھا۔

"کیا شاداں آج چراغ جلانے نہیں گئی؟"

"گئی ہے۔ میں نے اسے کٹیا کے دروازے تک جاتے دیکھا ہے۔ میں یہاں حویلی کے دروازے پر تھا جب وہ اندر چلی گئی تو میں یہاں آ گیا۔"

"تو پھر کٹیا میں اندھیرا کیوں ہے۔ جاؤ' عورتوں سے پوچھو' وہ واپس آئی ہے یا نہیں۔"

ایک بھائی کمرے سے باہر چلا گیا۔ باقی سب کھڑکی کے پار دیکھنے لگے۔ اسی وقت کٹیا میں روشنی کے آثار نظر آئے۔ چراغ جل رہا تھا لیکن اس کی روشنی خطرے کا سگنل بن گئی تھی۔

بہت دیر ہو گئی تھی لیکن چراغ کے جلانے کے بعد بھی شاداں کو رکنا پڑا کیونکہ مراد صبح سے بھوکا تھا اور اس کی لائی ہوئی روٹیاں کھا رہا تھا۔

روٹیاں کھانے کے بعد اس نے دونوں ہاتھوں سے مٹکی اٹھا کر بلند کی اور پانی کی دھار اپنے حلق میں ڈالنے لگا۔ اس کے بازو اٹھے ہوئے تھے۔ سینہ چٹان کی طرح پھیل گیا تھا۔ شاداں خمار آلود نظروں سے اس فولادی محبوب کو دیکھ رہی تھی۔ اسے چھوڑ کر جانے کو

جی نہیں چاہتا تھا مگر مجبور تھی اگلی ملاقات کے لیے اس وقت بچھڑ جانا ضروری تھا۔

پانی پیتے پیتے اچانک ہی مراد نے مٹکی رکھ دی اور وحشیوں کی طرح دیدے پھیلا کر ادھر ادھر دیوانوں کی طرح دیکھنے لگا۔

"کیا ہوا؟" شاداں نے [illegible] پوچھا۔

اس نے اس کے منہ [illegible] چپ رہنے کا اشارہ کیا پھر بیٹھے ہی بیٹھے لیٹ گیا اور زمین سے کان لگا کر کچھ [illegible] لگا۔ بہت دھیمی [illegible] سی آوازیں تھیں۔ ان آوازوں کو جنگل کے درندے ہی سن سکتے تھے یا پھر درندہ مراد سن رہا تھا اور سمجھ رہا تھا کہ کٹیا کے آگے پیچھے دائیں اور بائیں بہت سے لوگ ہیں۔ جو دبے پاؤں ادھر سے ادھر جا رہے ہیں اور کٹیا کو گھیر رہے ہیں۔

وہ فرش پر لڑھکتا ہوا اپنی رائفل اور کارتوس کی پیٹی کے قریب چلا آیا۔ شاداں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھ رہی تھی۔ اتنا تو سمجھ ہی گئی تھی کہ کوئی خطرہ پیش آگیا ہے۔

پھر باہر سے تھانیدار کی آواز سنائی دی۔

"مراد۔ تو چاروں طرف سے گھیرا جا چکا ہے۔ آج تجھے بھاگنے کا راستہ نہیں ملے گا چپ چاپ ہاتھ اٹھا کر باہر آجا....."

اس کے بعد بڑے بھائی کی آواز سنائی دی۔

"تھانیدار جی اس سے کہو کہ پہلے شاداں کو باہر بھیج دے۔"

"بھیج رہا ہوں۔ لو سنبھالو....." مراد نے دانت پیس کر کہا اور اس طرف فائر کر دیا۔ جہاں سے بڑے بھائی کی آواز آئی تھی۔ "ٹھائیں" کی آواز کے ساتھ ہی بڑے بھائی کی چیخ سنائی دی۔ شاداں چیختی ہوئی مراد سے لپٹ گئی اور گڑگڑا کر کہنے لگی۔

"نہیں مراد۔ تو میرے لیے جھگڑا کرے گا تو میں بدنام ہو جاؤں گی۔ مجھے یہاں سے جانے دے۔" مراد نے اس کے بالوں کو مٹھی سے جکڑ کر کہا۔

"تو یہاں سے جا کر مجھے نہتا کرنا چاہتی ہے۔ میں دشمنوں کی چال کو اچھی طرح سمجھتا ہوں تو جب تک یہاں رہے گی وہ مجھ پر گولیاں نہیں چلائیں گے اگر چلائیں گے تو مجھ سے پہلے اپنی بہن کو نشانہ بنائیں گے۔ میں اتنی آسانی سے مرنے والا نہیں ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے شاداں کو پیال کے بستر پر گرادیا اور وہاں سے پلٹ کر چراغ کو گل کردیا۔ کٹیا میں تاریکی پھیل گئی۔ باہر بھی تاریکی تھی۔ ابھی چاند بھی نہیں نکلا تھا۔ ستاروں کی مدھم روشنی میں دو ملازم بڑے بھائی کو اٹھا کر وہاں سے دور لے جارہے تھے۔ تھانیدار نے کہا۔

"انہیں حویلی سے دور لے جاؤ۔"

"نہیں۔" بڑے بھائی نے کراہتے ہوئے کہا۔ "گولی بازو کا گوشت ادھیڑ کر نکل گئی ہے زخم گہرا نہیں ہے۔ جب تک شاداں کٹیا کے باہر نہیں آئے گی میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ آہ ہماری عزت خاک میں ملنے والی ہے۔ اسی عزت کا بھرم رکھنے کے لیے ہم نے آج پنڈ کے ایک نوجوان کو مار ڈالا ہے آج اگر پنڈ والوں کو یہ معلوم ہوگیا کہ شاداں مراد کے ساتھ اس کٹیا میں ہے تو ہم کسی سے آنکھ ملا کر بات نہیں کرسکیں گے۔ تھانیدار جی! فائرنگ کی آواز دور تک گئی ہوگی۔ لوگ فائرنگ کی وجہ معلوم کرنے یہاں آسکتے ہیں۔ آپ میرے بھائیوں اور ملازموں کو لے کر جایئے اور پنڈ والوں کو حکم دیجئے کہ وہ اپنے گھروں سے نہ نکلیں۔ کیوں کہ ہم مراد کو گھیر رہے ہیں۔ ہم یہ نہیں چاہتے کہ پنڈ والے فائرنگ کی زد میں آجائیں۔ اگر کسی نے شاداں کی چیخ سنی ہو تو کہہ دینا کہ وہ حویلی کی ایک ملازمہ کو اٹھا کرلے جارہا تھا ایک جگہ گھیر لیا گیا ہے آپ ہمیں بدنامی سے بچانے کے لے جو کچھ کرسکتے ہیں کریں۔ میں آپ کو منہ مانگا انعام دوں گا۔"

تھانیدار اس کے تین بھائیوں اور چند ملازموں کے ساتھ وہاں سے چلا گیا۔ باقی چار بھائی اور دو سپاہیوں نے مل کر کٹیا کو چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا اور دونوں سپاہی کٹیا کے پیچھے زمین پر لیٹے ہوئے تھے۔ سب کی رائفلیں سیدھی تھیں اور ان کا رخ کٹیا کی جانب تھا۔

پھر ایک بھائی نے درخت کے پیچھے سے شاداں کو مخاطب کیا۔

"شاداں۔ تو جب تک کٹیا میں ہے اس وقت تک ایک آواز نہ نکالنا اگر تیری آواز پنڈ والوں تک پہنچ گئی تو ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہے گے۔"

مراد نے چھت کی طرف منہ اٹھا کر فلک شگاف قہقہہ لگایا۔

عزت اتنی ہی پیاری ہے تو میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔ میں شاداں کو لے کر یہاں

سے جاؤں گا اگر تم لوگ چھپ کر حملہ کرو گے تو میرے ساتھ تمہاری بہن بھی ماری جائے گی اور اگر چپ چاپ مجھے یہاں سے نکل جانے دو گے تو یہ تمہیں صبح سے پہلے واپس مل جائے گی۔"

شاداں نے دیوار کی طرف رخ کر کے کہا۔

"لالہ۔ اس کی بات مان لے۔ یہ زبان کا دھنی ہے۔ مجھے صبح سے پہلے چھوڑ دے گا۔"

"تو بکواس نہ کر۔" بھائی نے ڈانٹ کر کہا۔ "تجھ سے زبان بند رکھنے کے لیے کہا ہے۔ تو خاموش رہ ہم اس سے نمٹ لیں گے۔"

ایک گڑھے میں چھپے ہوئے دو بھائیوں میں سے ایک بھائی دوڑتا ہوا بیل گاڑی کے پیچھے آیا۔ اس نے وہاں چھپے ہوئے بھائی کے کان میں کچھ کہا پھر دونوں نے بیل گاڑی کے اگلے حصے کو پکڑ کر دھکیلتے ہوئے کٹیا کی دیوار سے ٹکرا دیا۔ کٹیا میں ایک زلزلہ سا آگیا۔ بانس کی دیوار لرزتی اور کڑکڑاتی ہوئی اندر کی طرف جھک گئی۔

"ٹھائیں۔ ٹھائیں۔" مراد نے دو فائر کئے پھر چیخ کر کہا۔

"بے وقوفو! تم میرا محاذ توڑ کر شاداں کو نہیں لے جا سکو گے۔ عقل سے کام لو ورنہ میں تمہاری عزت خاک میں ملا دوں گا۔"

شاداں اس کے پیروں سے لپٹ کر بولی۔

"نہیں مراد ایسی بات زبان پر نہ لا۔ تو نے ابھی وعدہ کیا تھا کہ مجھے بدنام نہیں ہونے دے گا۔ تیرا دعویٰ ہے کہ تو زبان کا سچا ہے پھر تو اپنی زبان سے کیوں پھرتا ہے۔ مجھے تماشا کیوں بنا رہا ہے۔ پنڈ کے لوگ ادھر آگئے تو وہ تیری شاداں کو کیا کہیں گی؟"

مراد۔ ذرا دیر تک چپ رہا پھر بولا۔

میں تجھے بدنام نہیں کر رہا ہوں۔ میں اپنی زبان پر قائم ہوں۔ تیرے بھائی یہاں ہنگامہ کر کے تجھے بدنام کرنا چاہتے ہیں۔"

"ہنگامہ صرف تیرے لیے نہیں میرے لیے بھی ہے۔ میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔ تو تم مردوں کا مقابلہ ہو گا۔ تمہارے درمیان ایک عورت بدنام نہیں ہو گی۔"

"تو خود غرض ہے۔ مجھے چھوڑ کر جانا چاہتی ہے۔"

"خود غرض تو ہے۔ مرد ہو کر ایک عورت کو ڈھال بنا رہا ہے کیا یہی تیری مردانگی ہے؟"

مراد کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ شاداں سمجھتی تھی کہ اس کی بات تھپڑ کی طرح ہوگی۔ وہ جلدی سے اٹھ کر اس کی گردن میں بانہیں ڈال کر لپٹ گئی۔

"میں تجھ پر فخر کرتی ہوں کہ میرا مراد دلیر اور گبھرو جوان ہے۔ تیرا نام سن کر ڈوگرا شاہی کو پسینہ آجاتا ہے۔ میرے ساتوں بھائیوں کی آنکھوں سے نیند اڑ جاتی ہے۔ تو زبان سے جو کہتا ہے وہ پورا کر دکھاتا ہے۔ پھر اپنی محبت کو کیوں رسوا کر رہا ہے؟"

شاداں اسے اپنی محبت کا یقین دلا رہی تھی اور اپنی آزادی کے لیے التجائیں کر رہی تھی۔

کٹیا کی تاریکی میں مراد اس کے مچلتے ہوئے بدن کے لمس کو محسوس کر رہا تھا۔ اور سوچ رہا تھا کہ یہ وہی عورت ہے...... اس نے مجھے بہت کچھ دیا ہے اور ان کے بدلے صرف یہ چاہتی ہے کہ میں اس کی عزت کا بھرم رکھوں۔ محبت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اپنی جان حیات کو رسوائیوں سے بچایا جائے۔ مردانگی بھی یہی کہتی ہی کہ عورت کو ڈھال نہ بنایا جائے۔

اسے خاموش پاکر شاداں نے پوچھا۔

"تیری خاموشی کا کیا مطلب ہے؟ کیا تو اپنی شاداں سے سچی محبت نہیں کرتا ہے؟ تو عزت کے معنی نہیں سمجھتا ہے؟ اگر نہیں سمجھتا ہے تو بتا تو نے اپنی بہن کی رسوائیوں سے تلملا کر دھرم ویر کو کیوں مار ڈالا تھا؟ کیا دنیا میں تیری ایک بہن ہی تھی کیا میں کسی کی بہن نہیں ہوں۔ یہ کیسی خود غرضی ہے کہ لوگ صرف اپنی بہنوں کی عزت کا پاس کرتے ہیں اور دوسروں کی بہنوں کو کھلونا بنانے کے لیے محبوبہ کا خوب صورت سا خطاب دیتے ہیں اور محبت میں آزمائش کا وقت آئے تو اسے بدنام ہونے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔"

مراد نے تڑپ کر کہا۔

"بس کر شاداں مجھے الزام نہ دے تو نے تو مرد دیکھے ہی نہیں ہیں جو پیار کی آبرو کے لیے اپنی جان دے دیتے ہیں۔ جا یہاں سے چلی جا۔ میں سلامت بیگ سے اپنی بہن کا انتقام لینے کے لیے جی رہا تھا۔ اب تیری عزت کا بھرم رکھنے کے لیے موت کو گلے لگاؤں

گا۔ چلی جا یہاں سے......"

شاداں کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ مراد اسے جانے کی اجازت دے رہا ہے۔ وہ پھر ایک بار بولی۔

"تو سچ کہہ رہا ہے۔ کیا میں چلی جاؤں؟"

مراد نے شانے سے رائفل لٹکائی اور کہا۔

"ہاں شاداں تو میری محبت ہے' میری عزت ہے اور میری آخری مسرت ہے۔ میں تجھے بدنام نہیں ہونے دوں گا۔"

اس نے دونوں بازوؤں میں اسے اٹھالیا اور دروازے کی طرف جانے لگا۔ شاداں اچانک ہی اس سے لپٹ کر رونے لگی۔"

"تو یہاں سے فرار ہو جائے گا' ناں؟"

"تو میری پروانہ کر۔"

"کیسے نہ کروں۔ میں اس اعتماد کے ساتھ جا رہی ہوں کہ تو کبھی دشمنوں کے ہاتھ نہیں آتا۔ تو یہاں سے چلا جائے گا اور پھر ایک دن مجھ سے ملنے آئے گا' آئے گا ناں؟"

"ہاں۔ آؤں گا' وہ اندھیرے میں بڑی اداسی سے مسکرا رہا تھا۔

دروازے پر پہنچ کر اس نے اپنے بازوؤں سے اسے اتار دیا۔ وہ پھر اس سے لپٹ کر رونے لگی۔ آہ! عورت کے پیار کی یہی ادائیں مار دیتی ہیں۔ جاتے جاتے پلٹتی ہے۔ وصال کی آس دلاتی ہے اور جدائی کا روگ لگا جاتی ہے۔

"میں جاؤں۔؟"

"جلدی آئے گا ناں؟"

"جلدی آؤں گا۔"

وہ دروازے کی طرف پلٹ کر بلند آواز سے بولی۔

"ویرو ے.....! میں آ رہی ہوں گولی نہ چلانا۔

تمام لوگ چونکنے ہو کر دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔ دروازہ کھل گیا تھا۔ شاداں بھی وہاں کھڑی تھی۔ اس کے پیچھے مراد سائے کی طرح نظر آ رہا تھا۔ اگر وہ فوراً ہی ہٹ جاتی تو کوئی بھی اس سائے پر گولی چلا سکتا تھا لیکن مراد نے جب تک دروازے کو اندر سے

بند نہیں کیا۔ وہ وہاں جم کر کھڑی رہی۔ پھر آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی۔ ایک بھائی نے گڑھے سے سر ابھار کر کہا۔

"جتنی جلدی ہوسکے حویلی چلی جا۔ اب ہم مراد کو کتے کی موت ماریں گے۔"

"نہیں ویریا۔" وہ دوڑتے ہوئے گڑھے میں پہنچی اور بھائی سے بولی۔ اس نے ہم سب پر احسان کیا ہے۔ مجھے بدنامی سے بچایا۔ تم اسے جانے دو۔"

بکواس نہ کر' چپ چاپ حویلی چلی جا۔"

"نہیں جاؤں گی۔ ایک اکیلے کو گھیر کر مارنا بہادری نہیں۔"

اس کے بھائی نے ایک الٹا ہاتھ اس کے منہ پر رسید کیا۔ وہ الٹ کر گر پڑی۔ دوسرے بھائی نے کٹیا کی طرف فائر کر دیا۔

"نہیں۔" وہ چیختی ہوئے کٹیا کی طرف جانے کے لیے اٹھی مگر پاس بیٹھے ہوئے بھائی نے پکڑ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا

" کمینی چیختی ہے۔ پنڈ والوں کو اپنی عزت کا تماشہ دکھانا چاہتی ہے۔ میں تجھے زندہ دفن کردوں گا۔"

وہ محض دھمکیاں دے رہا تھا۔ اس وقت محاذ چھوڑ کر اسے حویلی تک پہنچانے نہیں جا سکتا تھا اس لیے اس کے منہ پر مضبوطی سے ہاتھ جمائے بیٹھا تھا۔

پھر چاروں طرف سے گولیاں چلنے لگیں۔ تمام گولیاں کٹیا کے اندر جا رہی تھیں لیکن مراد کی آواز نہیں آرہی تھی۔ اسی وقت دو بھائی تھانیدار کے ساتھ واپس آگئے تھے۔ انہیں بتا دیا گیا تھا کہ شاداں بخیریت کٹیا سے واپس آگئی ہے۔ تھانیدار نے مراد کو للکارتے ہوئے کہا۔

ادئے نامرادے۔ سیدھی طرح باہر آجا۔ ورنہ اسی کٹیا میں تیری قبر بنے گی......"

مراد کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا۔ وہ سب پریشان ہو کر سوچنے لگے کسی میں اتنی جرات نہیں تھی کہ وہ دروازے تک جاتا۔ کیا پتہ کہ کب اس کی طرف سے فائرنگ شروع ہو جاتی۔ تھانیدار کچھ سوچ کر اپنے دو سپاہیوں کی طرف گیا۔ تھوڑی دیر بعد سب نے یہ دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں کپڑے کا گولہ مشعل کی طرح جل رہا تھا' اس نے چیخ کر کہا۔

"سانپ بل سے باہر نہ آئے تو آگ جلا کر اسے باہر نکلنے پر مجبور کرتے ہیں۔ چل اب باہر آجا....."

یہ کہہ کر اس نے آگ کا گولا گھاس پھوس کی چھت پر پھینک دیا۔ سوکھی گھاس پر آگ کے شعلے لہرا لہرا کر پھیلتے چلے گئے اور بانس کی کھپچیوں سے بنی ہوئی دیواروں کو اپنی لپیٹ میں لینے لگے۔

شاداں اپنے بھائی کی مضبوط گرفت میں تلملانے لگی۔ اس کے منہ پر اتنی سختی سے ہاتھ جما ہوا تھا کہ وہ چیخ بھی نہیں سکتی تھی لیکن وہ دل ہی دل میں چیخ رہی تھی۔

"مراد۔ باہر آجا' مراد تو خاموش کیوں ہے؟ تو باہر کیوں نہیں آتا؟" شعلے بلند سے بلند تر ہو رہے تھے۔ کٹیا کے چاروں طرف آگ اتنی تیزی سے بھڑک رہی تھی کہ نہ کوئی اندر جا سکتا تھا اور نہ وہ باہر آسکتا تھا۔

تھانیدار دوڑتا ہوا بڑے بھائی کے پاس آیا اور پریشانی سے بولا۔

"چوہدری صاحب۔ وہ پاگل ہو گیا ہے۔ باہر نہیں آرہا ہے۔"

"اچھا ہے۔ اسے جل جانے دیجئے۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" تھانیدار نے کہا۔ میرے انعام کی رقم کا کیا ہو گا؟ مجھے دس ہزار روپے کیسے ملیں گے؟ "میں کیسے ثابت کروں گا کہ وہ جلی ہوئی لاش مراد علی بنگش کی ہے۔"

بڑے بھائی نے اپنے زخمی بازو پر ہاتھ رکھ کر کراہتے ہوئے کہا۔

"میں آپ کو دس ہزار روپے دوں گا۔ آپ اپنی زبان بند رکھیں۔ اس کا جل جانا ہی بہتر ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کم بخت نے روگی بابا کو ہلاک کر کے ان کی لاش کہیں چھپا دی ہے۔ اب وہ جل جائے گا تو پنڈ والے یہی سمجھیں گے کہ روگی بابا جل گئے ہیں۔ ہم بھی یہی کہیں گے کہ مراد کٹیا میں آگ لگا کر فرار ہو گیا ہے۔ ہم نے آگ بجھانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ آپ جانتے ہیں کہ روگی بابا کے بے شمار عقیدت مند ہیں۔ انہیں فریب میں رکھنے کے لیے کہانی گھڑنی پڑے گی۔ ورنہ ہمیشہ پنڈ والے یہ سوچ کر ہم سے نفرت کریں گے کہ ہم نے کٹیا میں آگ لگا کر بابا کو زندہ جلا دیا ہے۔ خس کم جہاں پاک۔ ہم ہمیشہ کے لیے بدنامی سے بچ گئے۔ سرکاری طور پر مراد کی تلاش جاری رہے گی۔ مگر اب

سکون سے سویا کریں گے۔"

آگ بھڑک رہی تھی۔ شعلے بلند ہو رہے تھے اور دھواں آسمان کو چھونے جا رہا تھا۔ شاداں کے ہاتھ پر ایک مضبوط ہاتھ کا پہرہ تھا وہ وحشت سے دیدے پھیلائے جلتی ہوئی کٹیا کو دیکھ رہی تھی۔ اس جلتی ہوئی کٹیا سے ایک دن مراد نے اسے نکالا تھا اور آج اسی کٹیا کی آگ میں محبت کی کہانی کو انجام تک پہنچا رہا تھا۔ آگ...... ایک لالچ کی آگ ہوتی ہے وہ آگ تھانیدار نے انعام کے لالچ میں لگائی تھی۔

ایک غیرت کی آگ ہوتی ہے۔ سات بھائیوں نے غیرت کے نام پر وہ آگ لگائی تھی اور انتقام کے نام پر دل کی آگ بجھا رہے تھے۔ ایک محبت کی آگ ہوتی ہے جس میں پروانہ جلتا ہے۔ وہ خاموشی سے جلنے اور مرنے والا پروانہ نہیں تھا۔ اس کے ہاتھوں میں رائفل تھی۔ نشانہ سچا تھا۔ کارتوس اتنے تھے کہ وہ گھنٹوں مقابلہ پر ڈٹا رہتا یا تو ہمیشہ کی طرح دشمنوں کو مار کر نکل جاتا یا بہادری سے لڑتے لڑتے مر جاتا مگر لڑنے کی آرزو مر گئی تھی۔ وہ کس کے لیے لڑتا؟ وہاں سے صحیح سلامت نکل جاتا تو پھر کسی دن محبت کی آگ اسے کھینچ کر لاتی۔

یہی ہوتا ہے جہاں پیار کی شمع جلتی ہے۔ وہاں پروانہ آتا ہے۔ شمع آنسو بہاتی ہے۔ "ہائے میں بدنام ہو جاؤں گی۔" اور پروانہ فیصلہ کرتا ہے کہ بار بار آ کر بدنامیوں کے اندیشے پیدا کرے یا ایک ہی بار جل کر شمع کی آبرو رکھ لے؟ وہ تمام رسوائیوں کو سمیٹ کر ایک ہی بار جل گیا۔

شاداں کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسوؤں کے قطرے ٹپکنے لگے۔

"نی شاداں۔! تم نے وہ مرد دیکھے ہی نہیں جو پیار کی آبرو کے لیے اپنی جان دیتے ہیں۔"

پروانہ جل رہا تھا شمع جلا رہی تھی اور موم کے آنسو رو رہی تھی۔

○☆○